ترتیب

❖ روزہ، قرآنی ہدایات کی روشنی میں	سید قطب شہیدؒ	۷
❖ احکام و آداب صوم کے تشریعی اصول	شاہ ولی اللہؒ	۱۹
❖ روزے کے آداب و حقیقت	امام ابو حامد محمد غزالیؒ	۲۹
❖ صالح فرد اور اجتماع کی تشکیل میں روزے کا کردار	سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ	۳۷
❖ رمضان کی حقیقت	سید سلیمان ندویؒ	۴۷
❖ روزہ اور ترکِ گناہ	مولانا اشرف علی تھانویؒ	۵۳
❖ عشرہ اعتکاف اور شب قدر	مولانا اشرف علی تھانویؒ	۵۷
❖ اعتکاف کے مسائل	عروج احمد قادریؒ	۶۵
❖ عید الفطر	محمود فاروقیؒ	۶۹
❖ تقلیل غذا، وسیلہ صحت	حکیم محمد سعیدؒ	۷۷

❖❖❖

ابتدائیہ

نفسِ انسانی کے تزکیے اور تربیت میں ماہِ رمضان کو جو مقام حاصل ہے، وہ ہر صاحبِ دل جانتا ہے۔ یہ ۳۰ روزوں کا لازمی ٹریننگ پروگرام ہر سال جھولی بھر لینے کے لیے آتا ہے۔ اس کے بارے میں سلف و خلف سب نے ہی لکھا ہے۔ جب محترم خرم مراد نے **ترجمان القرآن** کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی اور رمضان المبارک آیا تو انھوں نے اس موقع پر تمام تحریرات، روزہ اور رمضان کے موضوع پر منتخب کر کے شائع کیں اور اس طرح اس شمارے کو خاص نمبر کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

آپ کے ہاتھ میں جو کتابچہ ہے وہ یہی انتخاب ہے، ایک مضمون کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اُمید ہے کہ قارئین اسے نافع اور مفید پائیں گے، صرف خود پڑھ لینے پر اِکتفا نہیں کریں گے، بلکہ نیکیوں کے اس موسم بہار میں اس کی خوشبو خوب پھیلائیں گے۔

مسلم سجاد

روزہ، قرآنی ہدایات کی روشنی میں

سید قطب شہید رحمۃ اللہ علیہ

تقویٰ کی بنیادی اہمیت

اسلامی سماج کے لیے، جو مدینہ منورہ میں پہلی مرتبہ وجود میں آ رہا تھا، کئی اجتماعی احکام سورۃ البقرہ میں بیان ہوئے ہیں۔ ساتھ ہی کچھ فرض عبادات کا ذکر ہے۔ دونوں قسم کے احکام، سورت میں پاس پاس، ایک مجموعے کی صورت میں بیان کیے گئے ہیں۔ اور دونوں ایک ہی رسی--- تقویٰ اور خشیت الٰہی--- سے مربوط ہیں۔ اجتماعی احکام ہوں یا عبادات کی تفصیلات، دونوں کے ذکر کے بعد تقویٰ کا ذکر یکساں طور پر آیا ہے، اور مسلسل آیا ہے۔ نیز یہ دونوں قسم کے احکام آیات ''بر'' کے بعد، جو ایمانی فکر کے بنیادی اصولوں اور عملی رویے کے بنیادی احکام پر مشتمل ہے، بیان ہوئے ہیں۔

اسی سلسلے کی چند آیات [۱۷۸ تا ۱۸۸] ہیں۔ ان میں مقتولین کے قصاص اور اس کے سلسلے کے احکام کا تذکرہ ہے۔ ان میں موت کے وقت وصیت کرنے کا بیان ہے، پھر فریضہ صوم اور دُعا اور اعتکاف جیسی عبادات کا ذکر ہے، اور آخر میں مالی مقدمات کے سلسلے کے احکام ہیں۔

ان امور کا مسلسل ذکر اس دین کی حقیقت کی طرف ہمارے ذہن کو متوجہ کرتا ہے۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ یہ دین ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ اس کے اجتماعی احکام، اس کے تشریعی اصول اور اس کی عبادات، سب کے سب اسلام کے عقیدے ہی سے پھوٹتے ہیں۔ سب اس کلی فکر سے،

جو اس عقیدے سے پیدا ہوتی ہے، نکلتے ہیں اور سب اللہ سے تعلق کی واحد رسی سے بندھے ہوئے ہیں۔ ان سب کی غایت ایک ہے۔ اور وہ ہے واحد اللہ کی عبادت، جس نے پیدا کیا، جو رزق دیتا ہے اور جس نے انسانوں کو اپنی اس مملکت --- زمین --- میں اپنا خلیفہ بنایا۔ اور خلافت کو اس شرط کے ساتھ مشروط کیا کہ وہ اللہ وحدہ لاشریک پر ایمان لائیں، اس کی عبادت بجا لا کر اسی کی طرف متوجہ ہوں، اور اپنی فکر، اپنے اجتماعی احکام اور اپنے قوانین، سب اسی سے حاصل کریں۔

تقویٰ وہ مضبوط رسّی ہے جو انسانی نفوس کو ظلم و زیادتی سے روکے رکھتی ہے۔ ظلم و زیادتی قتل کے اقدام کی صورت میں ہو، ظلم یا قتل کا بدلہ لینے کی صورت میں۔ یہ تقویٰ کیا ہے؟ دلوں کا احساسِ ذمہ داری! خوفِ خدا! اللہ کے غضب سے بچنے کی فکر! اور اس کی رضا کی طلب!

تقویٰ کے بغیر کوئی شریعت قائم نہیں رہ سکتی، کوئی قانون کامیابی سے ہم کنار نہیں ہو سکتا۔ اور اجتماعی قوانین اور ادارے، جو احساسِ ذمہ داری اور خوف اور طمع کے جذبات سے عاری ہوں، فرد کی قوت سے زیادہ قوت کے حامل نہیں ہو سکتے۔

روزے کا مقام اور غایت

یہ ایک فطری بات ہے کہ جس اُمت پر اللہ کے نظام کو دُنیا میں قائم کرنے، اور اس کے ذریعہ نوعِ انسانی کی قیادت کرنے اور انسانوں کے سامنے حق کی گواہی دینے کے لیے جہاد فی سبیل اللہ فرض کیا جائے، اس پر روزہ فرض ہو۔ روزہ ہی سے انسان میں محکم ارادے اور عزم بالجزم کا نشوونما ہوتا ہے۔ روزہ ہی وہ مقام ہے جہاں بندہ اپنے رب سے اطاعت و انقیاد کے ساتھ مربوط ہوتا ہے۔ پھر روزہ ہی وہ عمل ہے جس کے ذریعہ انسان تمام جسمانی ضرورتوں پر قابو پاتا اور تمام دشواریوں اور زحمتوں کو — جو وہ صرف اس لیے اُٹھاتا ہے کہ اس کا خدا اس سے راضی ہو اور خدا کے یہاں جو اجر ہے، وہ اسے حاصل ہو — برداشت کرنے کی قوت حاصل کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس راہ کی --- جو گھاٹیوں اور کانٹوں سے بھری ہوئی ہے، جس کے

اطراف و جوانب میں مرغوبات ولذائذ بکھرے پڑے ہیں، اور جس پر چلنے والوں کو بہکانے والی ہزار ہا صدائیں مسلسل اُٹھتی رہتی ہیں___ مشقتوں اور صعوبتوں کو برداشت کرنے کے لیے نفوسِ انسانی کی تیاری کے مقصد کے لیے یہ عناصر لازمی و ناگزیر ہیں۔

روزے کے وہ فوائد اس کے علاوہ ہیں جو تجربہ اور مشاہدہ سے جسمانی وظائف کے سلسلے میں منکشف ہوئے ہیں۔ میرا اپنا میلان یہ ہے کہ عبادات کے سلسلے میں خدائی ہدایات کو بطور خاص حسی و مادی فوائد سے وابستہ نہ کیا جائے۔ کیونکہ ان ہدایات میں خدا کی اصل حکمت یہ ہے کہ انسانی وجود کو زمین میں اپنا رول ادا کرنے کے لیے تیار کیا جائے، اور اخروی زندگی میں اس کے لیے جو کمالِ مقدر ہے اس کے لیے اس کی تربیت کی جائے۔

اس کے باوجود میں اسے پسند نہیں کرتا کہ ان فرائض اور ان خدائی تعلیمات کے جو فوائد مشاہدے میں آئے ہیں، یا جن کا انکشاف علمِ انسانی سے ہوا ہے، ان کا انکار کر دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ انسانوں کے لیے جو فرائض متعین کرتا ہے اور جن امور کی وہ ہدایت دیتا ہے، ان سب میں اس انسانی وجود کے لیے خدائی تدابیر کی بہت سی مصلحتیں ہیں، اور ان میں یہ فوائد بھی ہو سکتے ہیں لیکن ہم خدائی احکام کی حکمت کو علمِ انسانی کے ان انکشافات پر معلق نہیں کر سکتے۔ اس علم کا دائرہ بہر حال محدود اور تنگ ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا___ جس کے تحت وہ انسانی وجود کی تربیت کر رہا ہے یا جس کے تحت وہ طبیعی میدان میں اس کائنات کو پروان چڑھا رہا ہے___ احاطہ و استیعاب کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ جانتا ہے کہ انسان کو کوئی حکم دینا ہو تو ضروری ہے کہ اس کی مدد کی جائے اور اس کے جذبات کو اُبھارا جائے، تاکہ وہ اس کی پکار پر لبیک کہے اور خوشی خوشی اس بار کو اُٹھائے۔ اِسی لیے وہ واضح کرتا ہے کہ روزہ کے حکم میں کیا حکمتیں اور فوائد ہیں، تاکہ اسے اطمینان قلب حاصل ہو اور وہ اس حکم سے مانوس ہو سکے۔

سب سے پہلے وہ روزے کے احکام کی ابتدا ''اے ایمان لانے والو!'' کی اس ندا سے کرتا ہے جو اہل ایمان کو محبوب ہے۔ اس ندا سے وہ انھیں ان کی اصل حقیقت یاد دلاتا ہے۔

پھر وہ انھیں بتاتا ہے کہ روزہ ایک قدیمی فریضہ ہے جو ہر خدائی شریعت میں اہل ایمان پر فرض رہا ہے۔اس فریضہ کا اولین مقصود تقویٰ، صفائے قلب، احساسِ ذمہ داری اور خشیت الٰہی کے لیے دلوں کو تیار کرنا ہے۔

وہ فرماتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۝۱۸۳ۙ (البقرہ ۲:۱۸۳)

اے ایمان لانے والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے کے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا۔اُمید ہے کہ تم خدا ترس بنو گے۔

اس آیت سے روزے کی عظیم غایت سامنے آتی ہے۔یہ تقویٰ ہے! تقویٰ دل میں زندہ و بیدار ہو تو مومن روزہ کے فریضہ کو اللہ کی فرمان برداری کے جذبے کے تحت، اس کی رضا جوئی کے لیے ادا کرتا ہے۔تقویٰ ہی دلوں کا نگہبان ہے۔وہی معصیت سے روزے کو خراب کرنے سے انسان کو بچاتا ہے، خواہ یہ دل میں گزرنے والا خیال ہی کیوں نہ ہو۔ قرآن کے اولین مخاطب جانتے تھے کہ اللہ کے یہاں تقویٰ کا کیا مقام ہے اور اس کی میزان میں تقویٰ کا کیا وزن۔یہی ان کی منزلِ مقصود تھی، جس کی طرف ان کی روحیں لپکتی تھیں۔ روزہ اس کے حصول کا ذریعہ اور اس تک پہنچانے کا راستہ ہے! قرآن اس تقویٰ کو منزلِ مقصود کی حیثیت سے ان کے سامنے رکھتا ہے تاکہ روزے کے راستے سے وہ اس منزل کا رخ کر سکیں۔لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔

قرآن، اس کے بعد نفسِ انسانی کو روزہ سے مانوس کرنے کے لیے، واضح کرتا ہے کہ روزے ہمیشہ کے لیے اور عمر بھر نہیں رکھنا ہیں۔صرف چند دن کے روزے ہیں! اس کے ساتھ بیماروں کو —— جب تک وہ صحت یاب نہ ہو جائیں —— اور مسافروں کو —— جب تک وہ مقیم نہ ہو جائیں —— روزہ رکھنے کی رخصت ہے، تاکہ وہ دُشواری میں نہ پڑیں۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ترغیب دیتا ہے کہ سفر اور مرض کے علاوہ ہر حال میں روزہ رکھیں۔ خواہ انھیں تکلیف اور مشقت سے دوچار ہونا پڑے۔

وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴿١٨٤﴾ (البقرہ۲: ۱۸۴)

تم روزہ رکھو، یہی تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم علم (وفہم) رکھتے ہو!

روزہ ہر حالت میں سرتاسر خیر ہے۔ روزہ کے سلسلے میں جو بات کھل کر ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ کہ روزہ ارادے کی تربیت، قوتِ برداشت کی تقویت اور راحت و آرام کے مقابلے میں اللہ کی عبادت کو ترجیح دینے کے لیے ہے، اور یہ سب امور اسلامی تربیت میں مطلوب ہیں۔ غیر مریض کے لیے روزے میں صحت کے پہلو سے جو فوائد ہیں، وہ مزید برآں ہیں۔ اس لیے خواہ روزہ دار کو تکلیف اور مشقت محسوس ہو، روزہ ہی اس کے لیے بہتر ہے۔

رمضان کی اہمیت

اللہ تعالیٰ تندرست اور مقیم کے لیے اس فریضہ کی ادائیگی کو ایک اور پہلو سے بھی مرغوب و محبوب بناتا ہے۔ وہ یہ کہ یہ رمضان کے روزے ہیں! اس مہینے کے روزے جس میں قرآن نازل ہوا! وہ قرآن جو اس اُمت کی دائمی و ابدی کتابِ ہدایت ہے! جو اسے تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لائی! جس نے اسے یہ وجود عطا کیا جس نے اس کے خوف و ہراس کو امن و امان سے بدل دیا! جس نے اسے زمین میں غلبہ و اقتدار بخشا! اور جس نے اسے وہ تمام بنیادی عناصر عطا کیے جن سے وہ ایک اُمت بنی! قرآن سے پہلے وہ کچھ بھی نہ تھی اور ان بنیادی عناصر کے بغیر وہ ایک اُمت نہیں رہتی۔ نہ زمین میں اس کا کوئی مقام رہتا اور نہ آسمان میں اس کا کوئی ذکر۔ قرآن کی اس نعمت کا کم سے کم شکر یہ ہے کہ ہم اس مہینے کے روزے رکھیں جس میں قرآن نازل ہو۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۭ (البقرہ۲: ۱۸۵)

رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا۔ انسانوں کے لیے سرتاسر ہدایت۔ جس میں

راہِ راست کے واضح دلائل اور (حق و باطل کے درمیان) فرق و امتیاز کرنے والی تعلیمات ہیں۔ تو تم میں سے جو کوئی یہ مہینہ پائے وہ اس (مہینے) کے روزے رکھے۔

دین آسان ہے

قرآن تیسری بار اس فریضہ کی ادایگی کا شوق دلاتے ہوئے اس حکم کے دینے اور رخصتیں عطا کرنے، دونوں میں، اللہ کی یہ رحمت بیان کرتا ہے۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۡ (البقرہ ۲:۱۸۵)

اللہ تمھارے لیے سہولت چاہتا ہے! تمھیں دشواری میں ڈالنا نہیں چاہتا!

اس عقیدے اور اس دین کے تمام احکام کے سلسلے کا یہ ایک عظیم قاعدہ ہے کہ یہ سب احکام آسان ہیں، ان میں کوئی دشواری نہیں۔ ہر باذوق دل یہ بخوبی محسوس کرتا ہے کہ پوری زندگی میں یہ احکام سہولت اور نرمی کے حامل ہیں۔ یہی نہیں، یہ احکام مسلمان فرد پر سہولت اور فراخی کی چھاپ لگا دیتے ہیں، جس میں کوئی تکلف اور پیچیدگی نہیں ہوتی۔ نرمی اور فراخی کی اس خصلت کے ساتھ تمام ذمہ داریاں، تمام فرائض اور سنجیدہ زندگی کی تمام سرگرمیاں حسن و خوبی کے ساتھ اس طرح ادا ہوتی ہیں گویا کہ رواں پانی کی ایک گزرگاہ ہے جس میں آسانی کے ساتھ پانی بہہ رہا ہے۔ یا ایک درخت ہے جو آسانی کے ساتھ اُوپر کی جانب بڑھتا اور نشوونما پاتا چلا جا رہا ہے۔ اور یہ سب کچھ طمانیت، اعتماد اور اللہ کی رضا و خوشنودی کی فضا میں ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ بندے کو اللہ کی رحمت کا اور اس بات کا مسلسل شعور رہتا ہے کہ اللہ اپنے مومن بندوں کے لیے سہولت چاہتا ہے، انھیں دشواری میں ڈالنا نہیں چاہتا۔

روزہ پر شکر

روزہ درحقیقت ایک ایسی نعمت بھی ہے جس پر خدا کی بڑائی کرنا اور اس کا شکر ادا کرنا چاہیے!

وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝۱۸۵ (البقرہ ۲:۱۸۵)

اور تم اللہ کی کبریائی کا اعتراف کرو اس بات پر کہ اس نے تمھیں ہدایت سے نوازا۔ اور اُمید

ہے کہ تم (اس کا) شکر ادا کرو گے۔

اس لیے کہ روزہ کی ایک غرض وغایت یہ بھی ہے کہ اہلِ ایمان اس ہدایت کی قدر و قیمت کا احساس پیدا کریں جو اللہ نے انھیں عطا کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ روزے کے زمانے میں اہلِ ایمان ہر زمانے سے زیادہ اس ہدایت کی قدر و قیمت کو اپنے نفوس میں محسوس کرتے ہیں۔ روزے کی حالت میں ان کے دل خدا کی نافرمانی کے لیے سوچ بچار اور ان کے اعضاء و جوارح معصیت کے ارتکاب سے رُکے ہوتے ہیں۔ انھیں خدا کی ہدایت کا اس طرح زندہ احساس ہوتا ہے گویا کہ وہ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو رہے ہوں اور یہ سب اس لیے کہ وہ اس ہدایت پر اللہ کی کبریائی کا اعتراف اور اس عظیم نعمت کی بخشش پر اس کا شکر ادا کریں، اور روزے کی اس اطاعت کے ذریعہ ان کے دل خدا کی طرف رجوع ہوں۔

اس تفصیل سے واضح ہے کہ روزہ، جو جسم اور نفسِ انسانی پر شاق ہے، اللہ کی عظیم نعمت ہے، اور اس کی غرض وغایت مومن کی تربیت ہے اور اُمت مسلمہ کو اس رول کے ادا کرنے کے لیے تیار کرنا ہے جسے ادا کرنے کے لیے وہ برپا کی گئی ہے۔ اس رول کی ادایگی کی حفاظت تقویٰ، اللہ کے نگران و نگہبان ہونے کے شعور اور ضمیر کے احساسِ ذمہ داری سے ہوتی ہے۔

روزے کا عظیم اَجر، قربِ الٰہی

قبل اس کے کہ روزے کے اوقات، اور روزے میں مختلف چیزوں سے متمتع ہونے اور ان سے باز رہنے کے تفصیلی احکام بیان ہوں، ہم درمیان میں ایک عجیب و غریب آیت پاتے ہیں۔ یہ آیت دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی جاتی ہے۔ اس آیت میں ہم روزے کی مشقت کا پورا اور محبوب و مرغوب عوض اور اللہ کی دعوت پر لبیک کہنے کی فوری جزا پاتے ہیں۔ یہ عوض، اور یہ جزا کیا ہے؟ اللہ کا قرب، اور اس کا ہماری دُعاؤں کو قبول فرمانا! اس حقیقت کی تصویر کشی ایسے صاف شفاف الفاظ سے کی گئی ہے کہ ان سے روشنی پھوٹی پڑتی ہے۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ

فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ﴿١٨٦﴾ (البقرہ ۲:۱۸۶)
جب میرے بندے تم سے میرے بارے میں پوچھیں تو میں قریب ہی ہوں۔ میں پکارنے والے کی پکار کا، جب وہ مجھے پکارتا ہے، جواب دیتا ہوں۔ تو انھیں چاہیے کہ وہ میری پکار پر لبیک کہیں اور مجھ پر یقین رکھیں۔ اُمید ہے وہ راہِ راست اختیار کرسکیں گے۔

''میں قریب ہوں! میں پکارنے والی کی پکار کا، جب وہ مجھے پکارتا ہے، جواب دیتا ہوں!'' — کتنی نرمی! کتنی شفقت! کتنی محبت! کتنا انس اور کتنا نور ہے ان الفاظ میں! اس محبت، اس شفقت اور اس قرب کے مقابلے میں روزے اور کسی بھی حکم کی مشقت کی کیا حیثیت ہے؟ آیت کے ایک ایک لفظ سے یہ محبوب طراوت اور ٹھنڈک ٹپکی پڑتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بندوں کی نسبت اپنی طرف فرمائی، میرے بندے کہا اور سوال کا جواب براہِ راست خود دیا۔ یہ نہیں فرمایا: ''ان سے کہو، میں قریب ہوں''۔ اس کے بجائے اللہ کی ذاتِ گرامی نے سوال کرتے ہی اپنے بندوں کو خود ہی جواب عطا فرمایا کہ ''میں قریب ہوں''۔ اسی طرح یہ نہیں فرمایا کہ ''میں دُعا کو سنتا ہوں''۔ اس کے بجائے اجابت دُعا کا اعلان کیا کہ ''میں دُعا کرنے والے کی دُعا کو، جب وہ مجھ سے دُعا کرتا ہے، قبول کرتا ہوں''۔

یہ ایک عجیب و غریب آیت ہے! یہ آیت مومن کے قلب میں شیریں طراوت، اُنس و محبت، رضا و طمانیت اور اعتماد و یقین کو انڈیل دیتی ہے اور اس کے نتیجہ میں مومن کی زندگی، اطمینان و سکون اور محبت و قربت سے بہرہ ور ہوتی اور مومن کو ایک پُرامن جائے پناہ اور پُرسکون جائے قرار نصیب ہوتی ہے۔

اس محبوب اُنس، اس پُرخلوص قرب اور خدا کی طرف سے اجابت دُعا کی اس بشارت کے سائے میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو متوجہ فرماتا ہے کہ وہ اس کی دعوت پر لبیک کہیں اور اس پر یقین رکھیں! اُمید ہے کہ یہ روش ان کی ہدایت و رشد اور خیر و صلاح کی موجب بنے گی۔

اللہ کی دعوت پر لبیک کہنے اور اس پر ایمان و یقین رکھنے کا آخری ثمرہ بندوں ہی کے لیے ہے۔

یہ ثمرہ ہے رشد و ہدایت اور خیر وصلاح۔ ورنہ اللہ تو اہل جہاں (اور ان کی عبادت و اطاعت) سے بے نیاز ہے۔

اللہ پر ایمان و یقین اور اس کی دعوت پر لبیک کہنے سے جو رشد پیدا ہوتا ہے، رشد بس وہی ہے۔ کیونکہ خدائے تعالیٰ نے نوعِ انسانی کے لیے جو خدائی نظام پسند کیا ہے وہی واحد صحیح، راست اور معتدل نظام ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے وہ جاہلیت وحماقت ہے جسے کوئی سمجھ دار اور راست رو انسان پسند کر سکتا ہے اور نہ وہ رشد و ہدایت کی طرف لے جانے والا ہے۔ اور اللہ کے یہاں سے بندوں کی دُعاؤں کی قبولیت کی اُمید اسی وقت کی جا سکتی ہے جب کہ بندے اس کی دعوت پر لبیک کہیں، اور راہِ راست پر گامزن ہوں۔ بندوں کا کام یہ ہے کہ وہ اللہ سے دُعا کریں، اور اس کی قبولیت کے سلسلے میں جلد بازی نہ کریں۔ کیونکہ دُعا اپنے وقت پر ہی قبول ہوگی، جسے اللہ تعالیٰ اپنے حکیمانہ منصوبے کے تحت متعین فرماتا ہے۔

دُعا کی قبولیت

ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا،

اللہ تعالیٰ کو اس بات سے شرم آتی ہے کہ بندہ اپنے دونوں ہاتھ اس کے آگے پھیلائے، اور اس سے کسی بھلی چیز کا سوال کرے، اور وہ اس کے ہاتھوں کو خالی لوٹا دے۔

ترمذی نے اور امام احمد نے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا،

زمین کی پشت پر رہنے والا جو مسلمان بھی اللہ عزوجل سے کوئی دُعا مانگتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی مانگی ہوئی چیز دے دیتا ہے، یا اس جیسی کسی مصیبت کو آنے سے روک دیتا ہے، جب تک کہ وہ گناہ یا قطع رحم کی دُعا نہ کرے۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا،

تم میں سے ہر شخص کی دُعا قبول ہوگی، اِلاّ یہ کہ وہ جلد بازی کرے اور کہے، میں نے دُعا

کی اور وہ قبول نہیں ہوئی۔

صحیح مسلم میں ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا،

بندے کی دُعا قبول ہوتی ہے جب تک وہ گناہ یا قطع رحمی کی دُعا نہ کرے، جب تک وہ جلد بازی نہ کرے۔ پوچھا گیا، اے اللہ کے رسول ﷺ! جلد بازی کیا ہے؟ فرمایا، دُعا کرنے والا کہے کہ میں نے دُعا کی، اور پھر کی، لیکن مجھے نظر نہیں آ رہا کہ میری دُعا قبول ہوگی۔ پھر وہ تھک کر بیٹھ جاتا ہے اور دُعا کرنا چھوڑ دیتا ہے۔

اور روزہ دار کی دُعا سب سے زیادہ قبول ہوتی ہے، جیسا کہ امام ابوداؤد طیالسی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں اپنی اسناد کے ساتھ روایت کیا،

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انھوں نے کہا، میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا کہ اُنھوں نے فرمایا، روزہ دار کے افطار کے وقت اس کی دُعا قبول ہوتی ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ جب روزہ افطار کرتے تو اپنے اہل وعیال کو بلاتے اور دُعا کرتے۔

اور ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ نبی ﷺ نے فرمایا،

روزے دار کی دُعا، جو وہ افطار کے وقت کرے، رد نہیں ہوتی۔

اور احمد رحمۃ اللہ علیہ، ترمذی رحمۃ اللہ علیہ، نسائی رحمۃ اللہ علیہ اور ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

تین اشخاص ہیں، جن کی دُعا رد نہیں ہوتی۔ عادل فرماں روا، روزہ دار جب کہ وہ افطار کرے، اور مظلوم کی دُعا جسے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز بادلوں سے اُوپر اٹھائے گا۔ اس کی دُعا کے لیے آسمان کے دروازے کھل جاتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ''میری عزت و جلال کی قسم! میں تیری ضرور مدد کروں گا، خواہ کچھ مدت بعد ہو!''

اِسی لیے روزے کے بیان کے درمیان میں دُعا کا ذکر آیا ہے۔

حرام وناحق مال کھانے کی ممانعت

روزہ رکھنے اور روزے کے درمیان کھانے پینے سے باز رہنے کے حکم کے زیر سایہ ایک اور قسم کے کھانے کی ممانعت آتی ہے، اور وہ ہے ''لوگوں کے مالِ ناحق طور پر کھانا''۔اس کی شکل یہ ہے کہ عدالت میں مقدمہ دائر کیا جائے، اور قرائن وحالات اور دستاویزوں کے سلسلے میں حاکم کو مغالطہ میں مبتلا کیا جائے، اور چرب زبانی اور حجت بازی سے اسے دھوکا دیا جائے، تاکہ وہ ان حالات کے مطابق فیصلہ کردے جو اس کے سامنے آئے ہیں، حالانکہ حقیقت واقعی اس کے خلاف ہے۔ یہ ممانعت حدود اللہ کے ذکر اور اللہ سے تقویٰ کی دعوت کے بعد کی گئی، تاکہ خشیت الٰہی کا، جو اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کے ارتکاب سے انسان کو روکتی ہے، سایہ اور اثر برقرار رہے۔

وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۝۱۸۸ (البقرہ ۲:۱۸۸)

اور تم لوگ آپس میں اپنے مال ناحق طور پر نہ کھاؤ، نہ انھیں حکام کے پاس لے جاؤ تاکہ لوگوں کے مال کا ایک حصّہ حق تلفی کر کے ہڑپ کرلو، جانتے بوجھتے۔

اس آیت کی تفسیر کے سلسلے میں ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ آیت ایک ایسے شخص کے سلسلے میں ہے جس کے پاس کسی کا مال ہو مگر اس کے سلسلے میں کوئی ثبوت موجود نہ ہو، پھر وہ انکار کردے کہ اس کے پاس کسی کا مال ہے۔ اور وہ حکام کے پاس جاکر مقدمہ بازی کرے، حالانکہ وہ خوب جانتا ہے کہ اس پر دوسرے کا حق ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ وہ دوسرے کی حق تلفی کر رہا ہے، اور حرام کھا رہا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''میں ایک انسان ہوں! میرے پاس کوئی شخص مقدمہ لے کر آتا ہے تو ہوسکتا ہے کہ تم میں سے وہ شخص دلیل پیش کرنے میں دوسرے سے زیادہ تیز ہو اور میں (اس کے دلائل سے متاثر ہوکر) اس کے حق میں فیصلہ کردوں! تو اگر میں (غلطی سے) کسی مسلمان کا

حق دوسرے شخص کو دے دوں تو یہ اس کے لیے دوزخ کی آگ کا ایک ٹکڑا ہے، خواہ وہ اسے اُٹھا کر لے جائے یا اِسے چھوڑ دے!''

اس طرح وہ انھیں ان کے اس علم کے حوالے کر دیتا ہے جو وہ اپنے دعوے کی حقیقت و اصلیت کے بارے میں رکھتے ہیں کیونکہ حاکم کے فیصلے سے نہ حرام حلال ہوتا ہے اور نہ حلال حرام۔ حاکم کے لیے تو لازم ہے کہ وہ ظاہر کے مطابق فیصلہ کرے، اور گناہ اس شخص پر ہوگا جو حیلے بہانے کر کے غلط فیصلہ کرالے۔

اس طرح مقدمہ اور مال و دولت کا معاملہ بھی اللہ کے تقویٰ سے متعلق ہو جاتا ہے، جیسا کہ قصاص، وصیت اور روزہ بھی تقویٰ سے متعلق و مربوط ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب اُمور کامل خدائی نظام کے جسم کے مختلف مربوط اعضاء و اجزاء ہیں اور یہ سب ایک ہی رشتے — تقویٰ — سے مربوط ہیں، جس سے کہ اس نظام کے تمام ٹکڑے مربوط ہیں۔ اس طرح خدائی نظام واحد وحدت کی شکل اختیار کر لیتا ہے، جس کے اجزاء کو متفرق اور ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سے کسی ایک جزو کو ترک کر دینا اور دوسرے جزو پر عمل کرنا کتابِ الٰہی کے ایک حصّہ پر ایمان اور دوسرے حصّے کے انکار کے مترادف ہے۔ اور انجام کے لحاظ سے یہ کفر ہی ہے۔[1]

❖❖❖

---

[1] فی ظلال القرآن، جلد اول، اُردو ترجمہ سید حامد علی، لاہور۔ ترتیب: خرم مراد

اِحکام و آداب صوم کے تشریعی اُصول

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ

بنیادی اُصول

اللہ تعالیٰ نے انسان پر ایک ایسی امانت کا بار رکھا ہے جس کو اٹھانے کی لیاقت اور استعداد نہ آسمان و زمین میں ہے نہ پہاڑوں میں۔ یہ امانت، اختیار و ارادہ اور اعمال کی مسئولیت کا مکلف ہونا ہے، جس کی وجہ سے انسان کو ایمان لانے اور اطاعت کرنے سے ثواب ملتا ہے، اور انکار و نافرمانی کرنے سے عذاب۔ انسان بالطبع عالم نہیں ہے، لیکن اس میں علم حاصل کر سکنے کی استعداد ہے۔ اسی لیے، اگر وہ علم حاصل نہ کرے، تو اسے جاہل قرار دیا جا سکتا ہے۔ اِسی طرح وہ بالطبع عادل نہیں ہے، لیکن وہ عادل بن سکتا ہے۔ اسی لیے اگر وہ عدل نہ کرے، تو وہ ظالم ہے۔

انسان و جن کے سوا جس مخلوق سے ہم واقف ہیں وہ دو نوع کی ہے۔ ایک وہ جو نہ جہل میں مبتلا ہو سکتے ہیں نہ ظلم کر سکتے ہیں، جیسے فرشتے۔ دوسرے وہ جو نہ علم حاصل کر سکتے ہیں نہ عدل کر سکتے ہیں، جیسے جانور۔ فرشتے حیوانی خصوصیات جیسے بھوک، پیاس، شہوت و غضب اور خوف و غم سے مبرا ہوتے ہیں۔ جانور اس نوعیت کے طبعی اور جسمانی تقاضے پورا کرنے ہی میں مشغول رہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو، اس امانت کا بار کامیابی کے ساتھ اٹھانے اور اپنے مقصد تخلیق کو پورا کرنے کے لیے، اس کی فطرت اور استعداد میں دونوں قسم کی خصوصیات اور قوتیں بخشی ہیں۔

ملکوتی بھی، اور حیوانی بھی۔ یا ملکیت اور بہیمیت۔ ملکوتی قوت وخصوصیات کا سرچشمہ روحِ انسانی ہے، جو فرشتوں سے علاقہ رکھتی ہے۔ حیوانی قوت وخصوصیات کا منبع نفسِ انسانی اور جسم ہے، جو سارے حیوانات و بہائم میں پایا جاتا ہے۔ مگر جسم ارضی روحِ انسانی کے لیے وہ سواری ہے جس کے ذریعہ وہ آخرت میں اپنی سعادت کی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتی ہے۔ اس لیے جسم بھی انسان کی سعادت اور کامیابی کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ اس کی ملکوتی خصوصیات۔

روح وجسم ایک دوسرے کے معاون ومددگار بھی ہو سکتے ہیں، اور ایک دوسرے کے مزاحم ومخالف بھی۔ ان دونوں کے درمیان مسلسل کشمکش برپا رہی ہے۔ روح ملکوتی بلندیوں کی طرف کھینچتی ہے، نفس حیوانی پستیوں کی طرف۔ جب نفس وجسم کی قوتیں غالب آجاتی ہیں، تو روح کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ روح کے تقاضے جب افراط وتفریط میں مبتلا ہو جائیں تو وہ جسم کے تقاضوں کو کچلنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ روش اس سواری کو کمزور کرنے یا ختم کر دینے کے مترادف ہے جو انسان کو کامیابی کی منزل تک پہنچا سکتی ہے۔

انسان کی حقیقی کامیابی اس میں پوشیدہ ہے کہ اس کی خواہشِ نفس اور ہوسِ عقل کے تابع ہو، اور نفسِ حیوانی روحِ انسانی کی اطاعت کرے۔ لیکن اگر خواہشات وشہوات نفسانی زیادی قوی ہوں تو وہ روح کے تقاضوں کی تکمیل میں مانع ہوتے ہیں، اس لیے ان خواہشات کو مغلوب کرنا اور قابو میں رکھنا ناگزیر ہے۔ ان خواہشاتِ نفس کو غالب کرنے والے اسباب میں سب سے زیادہ قوی اسباب کھانا پینا اور شہوانی لذتوں میں انہماک ہیں۔ اس لیے ان خواہشاتِ نفس کو قابو میں رکھنے کے لیے سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ ان چیزوں کو کم کیا جائے اسی لیے وہ تمام لوگ جو روحانی بلندیوں کا حصول چاہتے ہیں، وہ کسی بھی مذہب کے پیرو ہوں اور کسی بھی ملک کے رہنے والے ہوں، اس بات پر متفق ہیں کہ اس مقصد کے حصول کی بہترین تدبیر کھانے پینے اور لذتِ شہوانی میں انہماک کو کم کرنا ہے۔

مطلوب یہ ہے کہ نفس کی خواہشات روحانی وجود کی تابع ہو جائیں، اور صبغۃ اللہ میں رنگ جائیں۔ روح، جسم کے تقاضوں اور خواہشات سے آزادی حاصل کر لے۔ اس کا راستہ

اس کے سوا کوئی نہیں کہ روح ایک عمل کا مطالبہ نفس سے کرے، اور اس سے اطاعت کرائے، اسے سرکشی نہ کرنے دے۔ پھر بار بار یہی عمل دہرایا جائے، حتیٰ کہ روح کی اطاعت کرنا نفس کی عادت بن جائے۔ مثلاً اکل وشرب اور شہوت جیسی چیزوں کو ترک کرنے کا مطالبہ، جن کی خواہش نفس کرتا ہے اور جن سے اسے لذت حاصل ہوتی ہے۔ یہی روزہ ہے۔

تدابیر زندگی، اہل وعیال اور اموال میں مشغولیت کی وجہ سے سب لوگوں کے لیے خود سے اس قسم کے مجاہدہ اور ریاضت کا پابند رہنا ممکن نہیں، اس لیے یہ ضروری ہوا کہ عام آدمی پر وقفے وقفے سے، اتنی مقدار میں اس ریاضت کو فرض کیا جائے کہ اس کے روحانی تقاضوں کی تکمیل کا سامان بھی ہو اور جو کوتاہیاں ہوگئی ہوں ان کی تلافی بھی ہو جائے۔ گویا وہ اس گھوڑے کی طرح ہو جائے جو لمبی رسّی سے ایک کھونٹے سے بندھا ہوا اور دائیں بائیں چکر لگا کر پھر اپنے تھان پر آ کھڑا ہو۔

یہ بھی ضروری ہے کہ مدت اتنی مقرر کی جائے کہ افراط وتفریط کا امکان نہ ہو۔ نہ کمی کرنے والا اس عبادت کو اتنا کم کر دے کہ اس کو کوئی فائدہ نہ پہنچے، نہ زیادتی کرنے والا اتنا زیادہ کر لے کہ اس کا نشاط جاتا رہے، اور وہ اپنے نفس کو زندہ درگور کر دے۔ اصل میں روزہ ایک تریاق کی طرح ہے۔ اس لیے اس کا استعمال بقدر ضرورت ہی کرنا صحیح ہے۔

تقلیل اکل وشرب کے دو طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ کھانے کی مقدار کم کر دی جائے، دوسرے یہ کہ کھانوں کے درمیان وقفہ طویل کر دیا جائے۔ شریعت نے دوسری صورت اختیار کی ہے۔ اس لیے کہ اس طریقے سے آدمی کمزور ہوتا ہے، تھکتا ہے اور بھوک پیاس کو محسوس کرتا ہے۔ حیوانی خواہشات پر چوٹ بھی پڑتی ہے۔ پہلے طریقے میں کوئی دیرپا اثر نہیں پڑتا، مگر آدمی تھک جاتا ہے۔ نیز اس طریقے میں ہر عام آدمی کے لیے ایک ہی قانون نہیں بنایا جا سکتا۔ لوگوں کی حالت مختلف ہوتی ہے، ایک آدمی ایک پاؤ کھاتا ہے تو دوسرا آدمی آدھا سیر۔ خوراک کی مقدار میں جو کمی ایک آدمی کے ضبطِ نفس کے لیے ضروری ہوگی، وہ دوسرے کے لیے ہلاکت کا باعث بن سکتی ہے۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ مدت کا تعین لوگوں کی رائے پر چھوڑا جائے۔ اس لیے

کہ ایسا کرنا قاعدہ تشریع کے خلاف ہوگا۔ یہ مدت طویل بھی نہ ہونا چاہیے کہ صحت کے لیے مضر ہو جائے، اس لیے کہ یہ مقصود شرعی کے خلاف ہوگا، اور عام لوگوں کے لیے نا قابلِ عمل۔

نیز یہ بھی ضروری ہے کہ بھوکا رہنا بار بار ہو، تا کہ مشق ہو اور اطاعت کا ملکہ پیدا ہو۔ ایک دفعہ بھوکا رہنے میں کوئی فائدہ نہیں، خواہ بھوک کتنی ہی شدید اور طویل ہو۔

یہ بھی ضروری ہے کہ نفس کو اس طرح مغلوب کرنے کے لیے کہ وہ ہلاکت تک نہ پہنچ جائے، بھوک پیاس کی مدت اور اس کی تکرار کے لیے مدت کے تعین میں ایسی مقداریں اختیار کی جائیں جو عام لوگوں میں مستعمل ہوں، اور جن کو ذی عقل، بیوقوف، شہری، دیہاتی سب جانتے ہوں۔

ان تشریعی اصولوں کے مطابق شریعت الٰہی میں روزہ کے لیے ایک دن کی مدت، اور تکرار کے لیے ایک ماہ کی مدت مقرر کی گئی۔

جب روزہ کی عبادت تمام لوگوں کے لیے فرض کی گئی، اور سب کی اصلاح اور عرب وعجم کی فلاح مطلوب ہوئی تو یہ ضروری ہوا کہ لوگوں کو اس مہینہ کے انتخاب میں آزاد نہ چھوڑا جائے، کہ ہر شخص اس مہینہ کو اختیار کرے جس میں اس کے لیے روزہ رکھنا آسان ہو۔ اس طرح تاویل اور عذر وفرار کا راستہ کھل جاتا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا دروازہ بند ہو جاتا، اور اسلام کی یہ عظیم الشان عبادت گمنامی اور غفلت کا شکار ہو جاتی۔

جب ایک مہینہ مقرر کرنا ضروری ہوا، تو اس مہینہ سے بہتر اور کون سا مہینہ ہو سکتا تھا جس میں قرآن مجید نازل ہوا، ملت مستحکم و راسخ ہوئی، اور جس میں شب قدر جیسی رات پائی جاتی ہے۔

حکمتِ احکام وآداب

نبی ﷺ نے فرمایا کہ ''جب تک چاند نظر نہ آئے روزہ نہ رکھو، اور چاند دیکھے بغیر روزے ختم نہ کرو۔ پھر اگر ابر ہو جائے تو اندازہ کرلو''۔

ایک روایت میں ہے کہ ''تیس روزے پورے کرلو''۔

روزوں کے لیے قمری مہینہ اختیار کیا گیا ہے جس کا انحصار رویت ہلال پر ہے، اور وہ کبھی

تیس دن کا ہوتا ہے اور کبھی انتیس کا۔ اسی لیے اشتباہ کی صورت میں قمری مہینہ کی اس بنیاد کی طرف رجوع کرنا ہی ضروری ہوا۔ وجہ یہ ہے کہ تشریع کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ احکام کی بنیاد ایسے امور پر ہو جن کو عام اور اَن پڑھ لوگ بھی آسانی سے جان لیں، بغیر اس کے کہ وہ تعمق میں پڑ کے بال کی کھال نکالیں، یا پیچیدہ حساب کتاب میں پڑیں۔ بلکہ شریعت نے ایسی چیزوں کا سد باب کیا ہے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ

''ہم ان پڑھ لوگ ہیں، نہ لکھنا جانتے ہیں نہ حساب کرنا''۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

''عید کے دو مہینوں، رمضان اور ذوالحجہ، میں کبھی نقصان نہیں ہوتا''۔

بعض نے کہا ہے کہ دونوں مہینے ایک ہی سال میں انتیس انتیس کے نہیں ہوتے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ مہینہ انتیس کا ہو یا تیس کا، اجر میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ دوسری توجیہہ قواعد تشریع کے زیادہ مطابق ہے۔ گویا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بات کا انسداد کیا کہ دلوں میں خواہ مخواہ ہی کوئی وہم یا کھٹک پیدا ہو۔

احکامِ صوم کے باب میں دوسرے احکام کی طرح شریعت کے اہم مقاصد میں سے یہ ہے کہ تعمق کے اسباب کا سد باب کیا جائے۔ یہود و نصاریٰ اور عبادت گزار اہلِ عرب بھی روزہ کا اہتمام کرتے تھے۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ روزہ کا اصل مقصود نفس کو مغلوب کرنا ہے، اس لیے اُنھوں نے تعمق کیا اور کئی بدُعات ایجاد کیں تاکہ نفس اور زیادہ مغلوب ہو۔ مگر اِسی طرح دین الٰہی میں تحریف ہوتی ہے۔ یہ تحریف کمیت اور کیفیت، دونوں پہلوؤں سے ہوتی ہے۔

کمیت کے لحاظ سے تحریف کے انسداد کی ایک مثال یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رمضان سے ایک یا دو دن پہلے روزہ رکھنے سے منع فرمایا، اور عید کے دن اور شک کے دن بھی روزہ رکھنے سے منع فرمایا۔ ایسے روزہ اور رمضان کے روزہ میں کوئی فصل نہیں ہے (جب کہ فرض کا ممیز رہنا اہم تشریعی اصول ہے)۔ اس کا بھی امکان تھا کہ وہمی لوگ ایسے روزہ کو اپنے اوپر

لازم کرلیں، اور متاخرین اس کو سنت سمجھ کر اس کی پابندی شروع کر دیں، اور اسی طرح ان کے بعد کے طبقات بھی۔ اس طرح (جو چیز لازم نہ تھی اس کو لازم کر لینے سے) دین میں تحریف ہو جائے۔ تعمق کی جڑ یہی ہے کہ احتیاط اس حد تک کی جائے کہ وہ فرض کی طرح ہو جائے۔

کیفیت کے لحاظ سے تحریف کے انسداد کی مثال یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صوم وصال (مسلسل بلا سحری روزہ) سے منع فرمایا ہے، سحری کھانے کی ترغیب دی ہے، اور سحری میں تاخیر کرنے اور روزہ جلد افطار کرنے کا حکم دیا ہے۔ کیونکہ یہ سب باتیں اس تشدد اور تعمق میں شامل ہیں جو جاہلیت کے کام ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس قول میں کہ

"جب شعبان کا مہینہ آدھا گزر جائے تو روزہ نہ رکھو"

اور اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث میں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رمضان اور شعبان میں متواتر روزے رکھتے، کوئی تعارض نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بذاتِ خود بعض ایسے افعال کرتے تھے جن سے اپنی اُمت کو منع فرماتے۔ یہ ممانعت تعمق اور تحریف کے سد باب کے لیے ہوتی ہے، یا اصول قائم کرنے کے لیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس بات سے مامون تھے کہ کسی چیز کو بے محل کریں یا حد سے تجاوز کریں کہ ضعف جسمانی یا ملال خاطر پیدا ہو، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا اور کوئی شخص مامون نہیں ہے، اس لیے باقی سب کے لیے ضروری ہوا کہ تشریع کے ذریعہ تعمق کا دروازہ بند کیا جائے۔

رویت ہلال کے ثبوت کے لیے ایک مسلمان کی شہادت کافی سمجھی گئی، وہ عادل ہو یا مستور الحال۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں صورتوں میں عمل فرمایا۔

ایک اعرابی آیا اور کہا کہ میں نے چاند دیکھا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے (صرف یہ) پوچھا، کیا تم گواہی دیتے ہو (کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں؟ اس نے کہا، ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، کیا تم گواہی دیتے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول ہیں؟ اس نے کہا، ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، اے بلال رضی اللہ عنہ! لوگوں میں منادی کر دو کہ کل روزہ رکھیں)۔

ایک دفعہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے گواہی دی کہ اُنھوں نے چاند دیکھا ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے روزہ رکھ لیا۔ ملت کے سارے معاملات کے بارے میں یہی حکم ہے (کہ غیر ضروری تحقیق و تفتیش سے اجتناب کیا جائے)۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ ”سحری کھایا کرو کیونکہ سحری کھانے میں برکت ہے“۔

سحری میں دو برکتیں ہیں:

ایک برکت جسم کے لیے ہے کہ وہ کمزور نہیں ہوتا۔ روزہ کا مقصد پورا کرنے کے لیے پورے ایک دن کھانے پینے اور شہوت سے رکنا کافی ہے۔ لہٰذا اس میں اضافہ نہ کرنا چاہیے۔

دوسری برکت کا تعلق تدبیر دینی سے ہے۔ وہ یہ کہ لوگ دین میں تعمق نہ کریں، اور اس میں تحریف و تغیر نہ داخل ہو۔

اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مزید فرمایا کہ

”جب تک لوگ افطار میں جلدی کرتے رہیں گے، ان کی حالت اچھی رہے گی“۔

نیز یہ کہ ”ہمارے اور اہلِ کتاب کے روزہ میں فرق سحری کھانے کا ہے“۔

ایک حدیث قدسی میں ہے کہ

”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے نزدیک وہ زیادہ محبوب ہے جو افطار میں جلدی کرتا ہے“۔

اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ ان معاملات میں اہلِ کتاب نے تحریف کی ہے، اس لیے ان سے مختلف رہنے اور ان کی داخل کردہ تحریف کو رد کرنے سے ملت صحیح راہ پر قائم رہے گی۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صوم وصال سے منع فرمایا ہے۔ یہ ممانعت بھی دو مقاصد کے لیے ہے۔ ایک یہ کہ روزہ جان کی ہلاکت کا سبب نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ دین میں تحریف نہ ہو۔

نیز نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ

”تم میں سے کوئی جب اذان سنے اور اس کے ہاتھ میں برتن ہو تو وہ اس کو رکھ نہ دے۔

بلکہ اپنی حاجت پوری کر لے‘‘۔

اذان سے مراد حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان ہے جس سے وہ سحری کا وقت ختم ہو جانے کا اعلان کرتے تھے (یہ ہدایت بھی تشدد وتعمق سے بچنے کے لیے ہے)۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ ہدایت کہ آدمی کھجوروں یا پانی سے افطار کرے، اس لیے ہے کہ انسان طبعاً میٹھی چیز کی طرف میلان رکھتا ہے، خصوصاً بھوک کی حالت میں۔ جگر بھی شیریں چیز کو پسند کرتا ہے، اور اہلِ عرب کی طبائع کھجور کو مرغوب رکھتی ہیں۔ ایسے اُمور میں طبیعت کے میلان پر اثر پڑتا ہے اور غذا صحیح طور پر ہضم ہو جاتی ہے۔ یہ بھی برکت کی ایک قسم ہے۔

افطار کے وقت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دُعاؤں میں سے ایک یہ ہے کہ

ذَهَبَ الظَّمَأُ وَابْتَلَّتِ الْعُرُوْقُ وَثَبَتَ الْاَجْرُ اِنْ شَاءَ اللهُ۔ [ابوداؤد:۲۳۵۷]

اس میں اشارہ ہے کہ جن باتوں کو انسان بالطبع مرغوب رکھتا ہے، یا اس کی عقل ان کو پسند کرتی ہے، ان کے حصول پر بھی شکر ادا کرنا چاہیے۔ اور ایک دُعا یہ ہے کہ

اَللّٰهُمَّ لَكَ صُمْتُ وَعَلٰى رِزْقِكَ اَفْطَرْتُ۔ [ابوداؤد:۲۳۵۸]

اس دُعا میں اخلاص عمل اور شکر نعمت کی تاکید ہے۔

نیز نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ

’’جب کوئی آدمی جمعہ کے دن روزہ رکھے تو اس سے پہلے یا اس کے بعد بھی ایک دن روزہ رکھے‘‘۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ

’’جمعہ کی رات کو قیام کے لیے اور دن کو روزہ کے لیے مخصوص نہ کرو‘‘۔

ان ہدایات کا راز دو حکمتوں میں ہے۔ ایک حکمت یہ ہے کہ تعمق کا دروازہ بند کرنا مقصود ہے۔ اس لیے کہ شارع نے جمعہ کے دن کو روزہ کے لیے بعض عبادات مخصوص کی ہیں،

اور اس کی فضیلت بھی بیان کی ہے۔ جمعہ کے دن کے لیے مخصوص کرنے میں اس بات کا امکان تھا کہ تعمق کرنے والے اس دن کے روزہ کو بھی انھی عبادات میں شمار کر لیں۔ دوسری حکمت یہ ہے کہ جمعہ کے دن کی حقیقت بحیثیت عید کے دن کے برقرار رہے۔ عید خوشی منانے اور لذت حاصل کرنے کا دن ہوتا ہے اور جمعہ کو عید قرار دینے میں یہ حکمت ہے کہ اس دن کا اجتماع لوگوں کے لیے ایسا اجتماع بن جائے جس میں وہ بغیر جبر و اکراہ کے، پوری رغبت کے ساتھ شریک ہوں۔ جمعہ کے دن روزہ رکھنے کو لازمی قرار دینے سے یہ حکمت مجروح ہوتی ہے۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ

''عید الفطر اور عید الاضحی کے دن روزہ رکھنا جائز نہیں''۔ اور یہ بھی کہ

''ایام تشریق کھانے پینے اور ذکرِ الٰہی کے دن ہیں''۔

ان ہدایات میں بھی یہی حکمت ہے کہ عید کے دنوں کی یہ حقیقت برقرار رہے کہ یہ خوشی کے دن ہیں، اور زہد خشک اور دین میں تعمق سے بچایا جائے۔

اس حدیث میں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم روزہ کی حالت میں مسواک کرتے تھے جس سے منہ کی بُو زائل ہوتی ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد میں کہ روزہ دار کے منہ کی یہ بُو اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے، کوئی تعارض نہیں ہے۔ دوسرے قول میں مبالغہ کا اسلوبِ بیان ہے۔ گویا کہ روزہ دار اللہ تعالیٰ کو اتنا محبوب ہے کہ اگر اس کے منہ میں بدبو بھی پیدا ہو جائے تو وہ بھی اس محبت کی وجہ سے اسے محبوب ہے (نہ یہ کہ روزہ دار کے منہ میں جو بدبو پیدا ہوتی ہے اسے زائل نہ کیا جائے)۔

یہ وہ بعض حکمتیں ہیں جو احکامِ صوم کے باب میں ملحوظ رکھی گئی ہیں۔[1]

❖❖❖

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ - ترجمہ و ترتیب: خرم مراد

روزہ کے آداب وحقیقت

امام ابوحامد محمد الغزالی رحمۃ اللہ علیہ

روزہ کے تین درجے ہیں۔ ایک عام آدمی پیٹ اور شرم گاہ کی خواہش پوری کرنے سے رُکا رہے تو اس کا روزہ ظاہری شرائط کے مطابق صحیح ہوجاتا ہے۔ حقیقی روزہ یہ ہے کہ آنکھ، کان، ہاتھ، پاؤں اور دیگر اعضا کو گناہ کرنے سے روکے۔ روزہ کا اعلیٰ ترین مقام یہ ہے کہ دل کو گناہ کے ارادوں اور دُنیا کی فکروں سے دُور رکھے، اور اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز سے اس کو خالی کردے۔ اللہ اور آخرت کے سوا کسی اور چیز کی، اور دُنیا کی فکر، میں مشغول ہونے سے اس درجہ کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے (یعنی روزہ کا کمال جاتا رہتا ہے)۔ ہاں، اگر دُنیا کی فکر دین کی خاطر ہو، تو ایسی فکرِ دُنیا سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ ایسی دُنیا آخرت کے لیے زادِراہ کا حکم رکھتی ہے۔

حقیقی روزہ کے لیے، جو اعضا کو گناہوں سے روکتا ہے، چھ (۶) آداب کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

حقیقی روزہ کے آداب

پہلا ادب یہ ہے کہ نظر نیچی رکھے۔ جن چیزوں کی طرف نگاہ ڈالنا اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے، ان کی طرف نگاہ کو نہ جانے دے۔ جن چیزوں کو دیکھنے سے دل بھٹکتا ہو اور اللہ کی یاد سے غفلت طاری ہوتی ہو، ان کو نہ دیکھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرما:

نظر ڈالنا (ایسی چیزوں پر جن سے اللہ نے روکا ہے) شیطان کے تیروں میں ایک زہر میں بجھا ہوا تیر ہے۔ جو کوئی اللہ کے خوف سے نگاہِ بد سے رُک جائے، اللہ تعالیٰ اس کے دل میں ایمان کی حلاوت کا مزا عطا کرے گا۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

پانچ چیزیں ایسی ہیں جن سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ایک جھوٹ، دوسرے غیبت، تیسرے چغلی، چوتھے جھوٹی قسم اور پانچویں شہوت کی نظر۔

دوسرا ادب یہ ہے کہ زبان سے بے ہودہ بات نہ کرے، جھوٹ نہ بولے، غیبت نہ کرے، چغلی نہ کھائے، فحش گفتگو نہ کرے، ظلم کی بات نہ کرے، جھگڑا نہ کرے یا بات نہ کاٹے۔ زبان کا روزہ یہ ہے کہ خاموش رہے، ان گناہوں سے بچے، اور اسے اللہ کی یاد اور تلاوتِ قرآن میں مشغول رکھے۔

سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ غیبت سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ دو چیزوں سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، ایک غیبت، دوسرے جھوٹ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

روزہ ڈھال ہے (گناہوں سے بچاؤ کے لیے)۔ تم میں سے کوئی روزہ سے ہو تو نہ فحش بکے نہ بدکلامی اور فضول گوئی کرے، نہ چیخے چلائے، اور اگر کوئی گالی دے یا لڑنے پر اُتر آئے تو کہہ دے کہ میں روزہ سے ہوں۔

ایک حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانے میں دو عورتوں نے روزہ رکھا۔ دن گزرنے کے ساتھ، بھوک اور پیاس کی شدت سے ان کی حالت خراب ہو گئی۔ اُنھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں آدمی بھیجا، اور افطار کی اجازت طلب کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس آدمی کو ایک پیالہ دیا، اور ارشاد فرمایا کہ ان دونوں سے کہنا کہ جو کچھ تم نے کھایا ہے اس پیالہ میں قے کر دو۔ ایک عورت نے قے کی تو آدھا پیالہ تازہ گوشت اور خون سے بھر گیا، دوسری نے قے کی تو پیالہ پورا بھر گیا۔ لوگوں کو بہت تعجب ہوا۔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اللہ نے فرمایا

کہ ان دونوں نے اس غذا سے تو روزہ رکھا جو اللہ نے حلال کی ہے، اور جو چیز اس نے حرام کی ہے اسے کھاتی رہیں۔ ایک دوسرے کے پاس بیٹھیں تو دونوں نے لوگوں کی غیبت شروع کردی۔ دونوں نے لوگوں کا جو گوشت کھایا تھا، وہی گوشت پیالے میں ہے۔

تیسرا ادب یہ ہے کہ کانوں کو بُری بات سننے سے روکے۔ اس لیے کہ جن باتوں کا زبان سے نکالنا حرام ہے، ان کا سننا بھی حرام ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے کانوں سے جھوٹ سننے والوں اور حرام کا مال کھانے والوں کا ذکر ساتھ ساتھ فرمایا ہے۔

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ؕ (المآئدہ۵: ۴۲)

یہ کان لگا کر جھوٹ سننے والے، اور حرام کا مال کھانے والے۔

اسی طرح اس نے یہ بھی ارشاد فرمایا،

لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ (المآئدہ۵: ۶۳)

کیوں ان کے علما اور مشائخ انھیں گناہ کی بات کہنے اور حرام کھانے سے نہیں روکتے۔

غیبت سننا اور خاموش رہنا بھی حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، پھر تو تم بھی انھی کی طرح ہوئے۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

غیبت کرنے والا اور سننے والا، دونوں گناہ میں برابر کے شریک ہیں۔

چوتھا ادب یہ ہے کہ ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضا کو گناہوں سے روکے، اور افطار کے وقت پیٹ کو ایسے کھانے سے بچائے جس کے بارے میں حرام ہونے کا شبہ بھی ہو۔ اگر دن بھر تو وہ کھانا بھی نہ کھائے جو حلال ہے، اور افطار حرام کھانے سے کرے، تو کیا روزہ ہوا؟ ایسے روزہ دار کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص محل تعمیر کرے مگر پورے شہر کو منہدم کردے۔ اگر ضرورت سے زیادہ کھایا جائے تو حلال کھانا بھی روح کے لیے مضر ہوتا ہے۔ اسی لیے روزہ کھانا کم کرنے کی تربیت کرتا ہے۔ وہ بہت بیوقوف ہوگا جو دوا تو زیادہ نہ کھائے کہ ضرر سے بچے، لیکن زہر

کھالے۔حرام کھانا زہر ہے جو دین کو برباد کرتا ہے، حلال کھانا ایک دوا کی طرح ہے جس کا کم کھانا مفید ہے اور زیادہ کھانا مضر۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

کتنے ہی روزہ دار ایسے ہیں جنھیں اپنے روزہ سے بھوک اور پیاس کے سوا کچھ نہیں ملتا۔

بعض کہتے ہیں یہ وہ روزہ دار ہے جو حرام کھانے سے روزہ افطار کرے۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ شخص مراد ہے جو روزہ کے دوران طعامِ حلال سے تو رُکا رہے، لیکن لوگوں کا گوشت کھاتا رہے، یعنی غیبت کرتا رہے جو حرام ہے۔ اور بعض کی رائے یہ ہے کہ یہ وہ شخص ہے جو اپنے اعضا کو گناہ سے نہ بچائے۔

پانچواں ادب یہ ہے کہ افطار کے وقت حلال کھانا بھی کم ہی کھائے۔ اتنا نہ کھا جائے کہ پیٹ پھول جائے۔ اس لیے کہ اللہ کے نزدیک حلق تک بھرے ہوئے پیٹ سے زیادہ ناپسندیدہ کوئی بھر جانے والی چیز نہیں، اگرچہ کھانا حلال ہو۔ شیطان پر غالب آنے اور شہوت کا زور توڑنے میں روزہ سے کیا مدد ملے گی اگر روزہ دار افطار کے وقت دن بھر کی بھوک پیاس کی تلافی کر دے اور ایک وقت میں اتنا کھالے جتنا دن بھر میں کھاتا تھا۔ افطار کے وقت کھانے کی انواع واقسام بھی زیادہ ہوتی ہیں، اور یہ عادت بھی عام ہے کہ رمضان کے لیے پہلے سے سامان خورد ونوش جمع کیا جائے۔ چنانچہ رمضان کے دنوں میں اچھے اور نفیس کھانے اتنے زیادہ کھا جاتے ہیں کہ اور دنوں میں کئی مہینے بھی نہ کھائیں۔

ظاہر ہے کہ روزہ کا مقصود تو خالی پیٹ رہنا اور خواہشِ نفس کو قابو میں رکھنا ہے، تا کہ نفس میں تقویٰ پیدا ہو۔ اب اگر کوئی صبح سے شام تک تو معدہ خالی رکھے یہاں تک کہ بھوک اور خواہش خوب بڑھ جائیں، پھر لذیذ کھانوں سے خوب پیٹ بھر لے، تو نفس کی خواہشات اور لذتیں دوبالا ہو جائیں گی، اور ایسی خواہشات بھی بیدار ہو جائیں گی جو روزہ نہ رکھتا تو نہ اُبھرتیں۔ روزہ کی روح اور اس کا مقصد نفس کے ان میلانات کو کمزور کرتا ہے جو گناہوں کی طرف کھینچتے ہیں، اور جن کو شیطان گناہوں میں مبتلا کرنے کا وسیلہ بناتا ہے۔ یہ میلانات کھانا کم کیے

بغیر کمزور نہیں ہو سکتے۔ یعنی شام کو اتنا ہی کھائے جتنا بغیر روزہ کے کھاتا تھا۔ اگر دوپہر کا کھانا اور رات کا کھانا ایک ساتھ کھالیا تو روزہ کا پورا فائدہ حاصل نہ ہوگا۔

بلکہ بہتر یہ ہے کہ دن میں زیادہ نہ سوئے، تاکہ بھوک پیاس کا مزہ محسوس ہو اور قوی میں بھی کمزوری کا احساس ہو۔ اسی طرح رات کو بھی اپنا پیٹ اتنا خالی رکھے کہ تہجد اور دیگر وظائف میں آسانی ہو، شیطان دل کے پاس نہ آنے پائے، اور عالم ملکوت کے دیدار سے فیض یاب ہو سکے۔

شب قدر میں (جب اللہ کے فرشتے نازل ہوتے ہیں) عالم ملکوت کا دیدار ہو سکتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے (اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ①)[۱] میں فرمایا ہے۔ جو اپنا پیٹ اتنا بھرے کہ پیٹ دل اور سینے کے درمیان حجاب بن جائے، اس کے اور عالمِ ملکوت کے درمیان بھی حجاب حائل ہو جائے گا۔ اگرچہ صرف پیٹ کا خالی رکھنا بھی کافی نہ ہوگا، جب تک وہ اپنی فکر اور ارادہ کو اللہ کے علاوہ ہر مقصود سے خالی نہ کر لے۔

چھٹا ادب یہ ہے کہ روزہ افطار کرنے کے بعد خوف ورجا کی کیفیت طاری ہو۔ اُمید رکھے کہ اللہ تعالیٰ اس کا روزہ قبول فرمائے گا اور اسے مقربین میں شامل کرے گا۔ ساتھ ہی ڈرے کہ شاید اس کا روزہ قبول نہ کیا جائے اور وہ اللہ کے غضب کا مستحق ٹھہرے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر عبادت سے فارغ ہونے کے بعد یہی کیفیت ہونا چاہیے۔

یہ روزہ کے وہ چھ آداب ہیں جن کو ملحوظ رکھنے ہی سے روزہ حقیقی معنوں میں صحیح ہوتا ہے۔ جو شخص صرف کھانے پینے اور شہوت سے رُک جانے کو کافی سمجھتا ہے، فقہاء اس کے روزہ کو، ظاہری شروط کے لحاظ سے، صحیح کہتے ہیں۔ اس لیے کہ قانونی طور پر ظاہری شروط کے مطابق ہی حکم لگایا جا سکتا ہے، تاکہ روزہ کا اطلاق ہر کس و ناکس پر ہو سکے۔ لیکن وہ علما جو آخرت پر نگاہ رکھتے ہیں، ان کے نزدیک روزہ کے صحیح ہونے کا مطلب آخرت میں اس کا قبول ہونا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ روزہ کا مقصد یہ ہے کہ آدمی بھوک اور پیاس اور شہوت سے بے نیاز ہو کر،

۱۔ القدر ۹۷:۱

اخلاق الٰہیہ میں سے خلق صمدیت کا پرتو اپنے اندر پیدا کر لے۔ اور فرشتوں کی طرح، کہ وہ خواہشات سے پاک ہیں، اپنی خواہشات پوری کرنے سے دستکش ہو جائے۔

پس ایسے روزہ سے کیا حقیقی فائدہ ہوسکتا ہے کہ آدمی ایک وقت کا کھانا تو چھوڑ دے مگر شام کو دونوں وقت کا کھانا ساتھ کھا لے، اور دن بھر نفس کی دیگر خواہشات پوری کرنے میں لگا رہے؟ اگر ایسا روزہ بھی مفید مطلب ہوتا، تو اس حدیث کے کیا معنی ہیں کہ کتنے ہی روزہ دار ایسے ہیں جنھیں اپنے روزہ سے بھوک اور پیاس کے سوا کچھ نہیں ملتا؟ ابودرداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ عقل مند آدمی کا سونا اور روزہ نہ رکھنا بھی خوب ہے، اور بے وقوف آدمی کا روزہ رکھنا اور جاگنا بھی بُرا ہے! کہا گیا ہے کہ یقین اور تقویٰ کے ساتھ ذرہ برابر عبادت، غلط کاریوں کے ساتھ کی ہوئی پہاڑ کے برابر عبادت سے افضل ہے۔ بعض علما نے کہا ہے کہ بہت سے روزہ دار درحقیقت بے روزہ ہوتے ہیں، اور بہت سے بے روزہ، روزہ دار۔ بے روزہ، روزہ دار وہ ہیں جو کھاتے پیتے تو ہیں مگر اپنے اعضا کو گناہوں سے محفوظ رکھتے ہیں اور روزہ دار بے روزہ وہ ہیں جو کھانے پینے سے تو رُک جاتے ہیں، لیکن اپنے اعضا کو گناہوں سے نہیں روکتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

روزہ ایک امانت ہے، اور ہر ایک کو اپنی امانت کی حفاظت کرنا چاہیے۔

جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت پڑھی

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا ۙ (النساء ۴:۵۸)

اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو۔

تو اپنے دست مبارک کو اپنے کان اور آنکھ پر رکھا، اور فرما:

''کان سے سننا اور آنکھ سے دیکھنا بھی امانت ہے''۔

سننا اور دیکھنا روزہ کی بھی امانت ہیں۔ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا

''اگر کوئی تم سے لڑائی کرے تو کہہ دے کہ میں روزہ دار ہوں''۔

گویا کہ میری زبان امانت ہے، اب تمھارے لڑائی کرنے سے میں اس میں خیانت کیسے کروں۔

جان لو کہ ہر عبادت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن، ایک پوست ہے اور ایک مغز۔ اب تم کو اختیار ہے پوست پر قناعت کرو اور مغز کو چھوڑ دو، یا دانائی کی راہ اختیار کرو (اور پوست کے ساتھ مغز بھی حاصل کرو)

نفل روزے

رمضان کے علاوہ بعض ایام میں روزہ رکھنے کی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ سال کے دوران یہ ایامِ عرفہ، عاشورہ اور ذی الحجہ اور محرم کے پہلے عشرے ہیں۔ ہر مہینے میں یہ درمیان کے ایام یعنی تیرھواں، چودھواں اور پندرھواں دن، اور ہر ہفتے میں یہ پیر اور جمعرات کے دن ہیں۔ ان دِنوں میں روزہ رکھنا اور خیرات کرنا مستحب ہے۔

باقی رہا ہمیشہ روزہ رکھنا، تو کمال کا درجہ تو یہ ہے کہ آدمی روزہ کی حقیقت سمجھے، یہ جانے کہ روزہ کا اصل مقصود دل کی صفائی اور خدا کا ہو رہنا ہے۔ جو شخص اس حقیقت کو سمجھتا ہے اور اپنے اندر کی حالت پر نظر کرتا رہتا ہے، تو کبھی اس کی حالت یہ تقاضا کرتی ہے کہ وہ برابر روزہ رکھتا رہے۔ کبھی یہ کہ برابر بے روزہ رہے۔ کبھی یہ کہ روزہ بھی رکھے اور بے روزہ بھی رہے۔ جب آدمی اپنے دل پر نگاہ رکھے اور طریق آخرت پر چلنے کے لیے روزہ کی حد کو سمجھ لے، تو دل کی بہتری کے لیے دوا کی کوئی ترتیب ضروری نہ رہے گی۔ اسی معنی میں یہ حدیث ہے کہ

> کبھی رسول اللہ ﷺ مسلسل اتنے روزے رکھتے کہ لوگ خیال کرتے کہ اب آپ ﷺ روزہ نہ چھوڑیں گے، اور کبھی مسلسل بے روزہ رہتے کہ لوگ کہتے کہ اب روزہ نہ رکھیں گے۔ کبھی رات کو اس قدر سوتے کہ لوگ سمجھتے کہ اب تہجد نہ پڑھیں گے، اور کبھی اتنا قیام اللیل کرتے کہ کہا جاتا کہ اب آپ ﷺ سوئیں گے نہیں۔[1]

❖❖❖

---

[1] احیاء العلوم، جلد اول۔ ترجمہ و ترتیب: خرم مراد

صالح فرد اور اجتماع کی تشکیل میں روزے کا کردار

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ

اسلام میں مراسمِ عبادت کی حیثیت

اسلام انسان کی پوری دنیوی زندگی کو عبادت میں تبدیل کر دینا چاہتا ہے، اس کا مطالبہ یہ ہے کہ آدمی کی زندگی کا کوئی لمحہ بھی خدا کی عبادت سے خالی نہ ہو، لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا اقرار کرنے کے ساتھ ہی یہ بات لازم آجاتی ہے کہ جس اللہ کو آدمی نے اپنا معبود تسلیم کیا ہے، اس کا عبد یعنی بندہ بن کر رہے، اور بندہ بن کر رہنے ہی کا نام عبادت ہے۔ کہنے کو تو یہ چھوٹی بات ہے اور بڑی آسانی کے ساتھ اسے زبان سے ادا کیا جاسکتا ہے، مگر عملاً آدمی کی ساری زندگی کا اپنے تمام گوشوں کے ساتھ عبادت بن جانا آسان کام نہیں، اس کے لیے بڑی زبردست ٹریننگ کی ضرورت ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ خاص طور پر ذہن کی تربیت کی جائے۔ مضبوط کیریکٹر پیدا کیا جائے۔ عادات اور خصائل کو ایک سانچے میں ڈھالا جائے، اور صرف انفرادی سیرت ہی کی تعمیر پر اکتفا نہ کرلیا جائے، بلکہ ایک ایسا اجتماعی نظام قائم کیا جائے جو بڑے پیمانہ پر افراد کو اس عبادت کے لیے تیار کرنے والا ہو، اور جس میں جماعت کی طاقت فرد کی پشت پناہ، اس کی مددگار اور اس کی کمزوریوں کو تلافی کرنے والی ہو۔ یہی غرض ہے جس کے لیے اسلام میں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی عبادتیں فرض کی گئی ہیں۔ ان کو عبادت کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بس یہی عبادت ہیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس اصلی عبادت کے لیے آدمی کو تیار کرتی ہیں۔ یہ اس کے لیے لازمی ٹریننگ کورس ہیں۔ انھی سے وہ مخصوص ذہنیت بنتی ہے، اس خاص کیریکٹر

کی تشکیل ہوتی ہے، منظم عادات وخصائل کا وہ پختہ سانچہ بنتا ہے، اور اس اجتماعی نظام کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں جس کے بغیر انسان کی زندگی کسی طرح عبادت الٰہی میں تبدیل نہیں ہوسکتی۔ ان چار چیزوں کے سوا اور کوئی ذریعہ ایسا نہیں ہے جس سے یہ مقصد حاصل ہوسکے۔ اسی بنا پر ان کو ارکانِ اسلام قرار دیا گیا ہے۔ یعنی یہ وہ ستون ہیں جن پر اسلامی زندگی کی عمارت قائم ہوتی اور قائم رہتی ہے۔

روزہ، غیر معمولی نظامِ تربیت

زکوٰۃ اور حج کی طرح روزہ ایک مستقل جداگانہ نوعیت رکھنے والا رکن نہیں ہے بلکہ دراصل اس کا مزاج قریب قریب وہی ہے جو رکن صلوٰۃ کا ہے اور اسے رکن صلوٰۃ کے مددگار اور معاون ہی کی حیثیت سے لگایا گیا ہے۔ اس کا کام انھی اثرات کو زیادہ تیز اور زیادہ مستحکم کرنا ہے جو نماز سے انسانی زندگی پر مرتب ہوتے ہیں۔ نماز روزمرہ کا معمولی نظامِ تربیت ہے جو روز پانچ وقت تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے آدمی کو اپنے اثر میں لیتا ہے اور تعلیم وتربیت کی ہلکی ہلکی خوراکیں دے کر چھوڑ دیتا ہے اور روزہ سال بھر میں ایک مہینہ کا غیر معمولی نظامِ تربیت (Special Training Course) ہے جو آدمی کو تقریباً ۷۲۰ گھنٹے تک مسلسل اپنے مضبوط ڈسپلن کے شکنجہ میں کسے رکھتا ہے تاکہ روزانہ کی معمولی تربیت میں جو اثرات خفیف تھے وہ شدید ہوجائیں۔

تربیت افراد کا ہمہ گیر انتظام

اسلام کا اصل مقصد صالحین کی ایسی جماعت بنانا ہے جو انسانی تمدن کو خیر وصلاح کی بنیادوں پر تعمیر کرے۔ مگر اس غرض کے لیے وہ صرف اجتماعی اصول وضع کرنے اور ان اصولوں کی بنیاد پر ایک نظام تمدن بنا دینے پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ ساتھ ساتھ اپنے اجتماعی نظام کے لیے افراد کو تیار کرنے کا بھی انتظام کرتا ہے تاکہ جماعت (سوسائٹی) جن افراد پر مشتمل ہو، ان میں ایک ایک شخص اپنے خیالات، اپنی سیرت اور اپنے کردار کے لحاظ سے اس نظام کے ساتھ بیش از بیش

موافقت رکھتا ہو، اور باغیانہ میلانات کے ساتھ مجبورانہ اطاعت کرنے کے بجائے اپنے نفس و روح کی پوری آمادگی، اپنے دل و دماغ کے مخلصانہ عقیدے، اور اپنی سیرت کی ذاتی قوت کے ساتھ اس کی پیروی کرے۔

اس اسکیم میں روزے کے رکن سے جو کام لیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ:

۱- اس تربیت کے ذریعہ سے جماعت کے ہر فرد کو خداوندِ عالم کی حاکمیت کے مقابلہ میں خود مختاری سے عمداً دست بردار ہو جانے کے لیے تیار کیا جائے، تا آنکہ وہ اپنی پوری زندگی کو الٰہی قانون کے تابع کر دے۔

۲- ہر فرد کے ذہن میں خدا کے عالم الغیب والشہادہ ہونے کا اور آخرت کی باز پُرس کا عقیدہ عملی مشق و تمرین کے ذریعہ سے اس طرح جاگزیں کر دیا جائے کہ وہ خود اپنی شخصی ذمہ داری کے احساس کی بنا پر، نہ کہ کسی خارجی دباؤ کی وجہ سے، قانونِ الٰہی کی خفیہ اور اعلانیہ اطاعت کرنے لگے۔

۳- ہر فرد کے اندر یہ روح پھونک دی جائے کہ وہ ماسوا اللہ کی بندگی و اطاعت سے اعتقاداً و عملاً منکر ہو جائے اور اس کی بندگی اللہ کے لیے اس طرح خالص ہو جائے کہ جس حکم یا جس قانون یا جس اقتدار کے لیے اس کی طرف سے کوئی سند نہ ہو، اس کی اطاعت کے لیے فردِ مومن کے نفس میں کوئی آمادگی بھی نہ ہو۔

۴- ہر فرد کی اخلاقی تربیت اس طور پر کی جائے کہ اسے اپنی خواہشات پر عملاً پورا اقتدار حاصل ہو، وہ اپنے نفس و جسم کی تمام قوتوں پر اتنا قابو رکھتا ہو کہ اپنے عقیدے اور علم و بصیرت کے مطابق ان سے کام لے سکے۔ اس میں صبر، تحمل، جفاکشی، توکل علی اللہ اور ثابت قدمی و یکسوئی کی صفات پیدا ہو جائیں اور اس کے کیرکٹر میں اتنی قوت آ جائے کہ وہ خارجی ترغیبات اور اپنے نفس کے ناجائز میلانات کا مقابلہ کر سکے۔

یہی وہ مقاصد ہیں جن کے لیے اسلام نے رمضان کے روزے ہر اس شخص پر فرض کیے

ہیں جو اسلامی جماعت کا رُکن ہو۔ کوئی عاقل و بالغ فرد، خواہ وہ عورت ہو یا مرد، اس فریضہ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ بیماری، سفر اور بعض دوسرے شرعی عذرات کی بنا پر کوئی شخص اس فرض کو ادا نہ کر سکتا ہو تو اس پر قضا یا فدیہ لازم ہے۔ بہرحال اسلام کے دائرے میں رہ کر کوئی انسان روزے کی فرضیت سے چھوٹتا نہیں ہے۔

اگرچہ یہ لازم نہیں کہ روزے کی تربیت سے تمام افراد کے اندر وہ خصوصیات بدرجہ اتم پیدا ہو جائیں جو اس سے پیدا کرنی مطلوب ہیں، کیونکہ ان کی پیدائش اور تکمیل کے لیے خود تربیت لینے والے میں ذاتی استعداد بھی ضروری ہے، لیکن بجائے خود اس نظامِ تربیت کی فطرت میں یہ خاصہ موجود ہے کہ اس سے یہ خصوصیات انسان میں پیدا ہوں اور ان خصوصیات کو پیدا کرنے کے لیے اس سے بہتر، بلکہ اس کے سوا کوئی دوسرا نظامِ تربیت تجویز نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ کوئی شخص صداقت پسندی کی نظر سے دیکھے تو اسے اعتراف کرنا پڑے گا کہ دُنیا میں اسلام کے سوا کوئی اجتماعی نظام ایسا نہیں ہے جس نے افراد کو تیار کرنے کا اتنا وسیع و ہمہ گیر انتظام کیا ہو کہ پوری آبادیاں اس کے دائرے میں آ کر خود بخود اخلاقی تربیت پاتی چلی جائیں۔

پھر اس کا مزید کمال یہ ہے کہ سوسائٹی کے حدود میں اگر کوئی فرد ایسا ناقص نکل آئے کہ اس اجتماعی نظام کا جزو بن کر نہ رہ سکتا ہو، تو وہ خود بخود الگ ممتاز ہو جاتا ہے۔ جہاں اس نے بغیر عذرِ شرعی کے روزہ ترک کیا اور فوراً ہی یہ بات سوسائٹی میں آشکارا ہو گئی کہ اس کے درمیان ایک منافق موجود ہے جو خدا کی حاکمیت تسلیم نہیں کرتا اور اپنی حیوانی جبلت کا بندہ بن کر رہنا چاہتا ہے۔ اس صریح علامت سے سوسائٹی کو اپنے جسم میں ایک سڑے ہوئے عضو کی موجودگی کا بروقت علم ہو جاتا ہے، اور اس کو موقع مل جاتا ہے کہ اپنے آپ کو اس کے زہر سے محفوظ کرے۔ کم از کم اسلام نے اپنی حد تک منافقین کی نشان دہی کا پورا انتظام کر دیا ہے اور ہر مسلم سوسائٹی کے لیے اس بات کا موقع فراہم کر دیا ہے کہ وہ عین وقت پر ان کے وجود سے آگاہ ہو کر یا تو

ان کی اصلاح کرے یا انھیں اپنے دائرے سے خارج کردے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ کوئی بے حس نام نہاد مسلم سوسائٹی اس موقع سے فائدہ نہ اٹھائے اور ایسے لوگوں کی نہ صرف اپنی گود میں پرورش کرے بلکہ انھیں اپنے سر پر بٹھائے اور زندہ باد کے نعرے لگائے۔

روزے کا اجتماعی پہلو

نماز کی طرح روزہ بھی بجائے خود ایک انفرادی فعل ہے، لیکن جس طرح نماز کے ساتھ جماعت کی شرط لگا کر اس کو انفرادی سے اجتماعی فعل میں تبدیل کر دیا گیا ہے، اسی طرح روزے کو بھی ایک ذرا سی حکیمانہ تدبیر نے انفرادی عمل کے بجائے اجتماعی عمل بنا کر اس کے فوائد و منافع کو اتنا بڑھا دیا ہے کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ تدبیر بس اتنی سی ہے کہ روزے رکھنے کے لیے ایک خاص مہینہ مقرر کر دیا گیا۔ اگر شارع کے پیش نظر محض افراد کی اخلاقی تربیت ہوتی تو اس کے لیے یہ حکم دینا کافی تھا کہ ہر مسلمان سال بھر کے دوران میں کبھی تیس دن کے روزے رکھ لیا کرے۔ اس طرح وہ تمام مقاصد پورے ہو سکتے تھے جن کا ذکر اُوپر کیا گیا ہے، بلکہ ضبطِ نفس کی مشق کے لیے یہ صورت زیادہ مناسب تھی کیونکہ اجتماعی عمل سے روزہ رکھنے میں جو آسانی افراد کے لیے پیدا ہو جاتی ہے وہ انفرادی عمل کی صورت میں نہ ہوتی اور ہر شخص کو اپنا فرض ادا کرنے میں نسبتاً زیادہ شدت کے ساتھ اپنی قوت ارادی استعمال کرنی پڑتی۔ لیکن اسلام کا قانون جس حکیم نے بنایا ہے اس کی نگاہ میں افراد کی ایسی تیاری کسی کام کی نہیں ہے جس کے نتیجے میں ایک جماعت صالحہ وجود میں نہ آئے، اس لیے اس نے روزے کو محض ایک انفرادی عمل بنانا پسند نہیں کیا، بلکہ سال بھر میں ایک مہینہ روزے کے لیے مخصوص کر دیا تاکہ سب مسلمان بہ یک وقت روزہ رکھیں اور وہی نظامِ تربیت جس سے افراد تیار ہوں، ایک صالح اجتماعی نظام بنانے میں بھی مددگار ہو جائے۔

اس حکیمانہ تدبیر سے روزے کے اخلاقی و روحانی منافع میں جو اضافہ ہوا ہے اس کی طرف یہاں چند مختصر اشارات کیے جاتے ہیں۔

ا۔ تقوٰی کی فضا

اجتماعی عمل کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ اس سے ایک خاص قسم کی نفسیاتی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک شخص انفرادی طور پر کسی ذہنی کیفیت کے تحت کوئی کام کر رہا ہو اور اس کے گرد و پیش دوسرے لوگوں میں نہ وہ ذہنی کیفیت ہو اور نہ وہ اس کام میں اس کے شریک ہوں، تو وہ اپنے آپ کو اس ماحول میں بالکل اجنبی پائے گا۔ اس کی کیفیت ذہنی صرف اسی کی ذات تک محدود اور صرف اسی کی نفسی قوتوں پر منحصر رہے گی، اس کو نشو ونما پانے کے لیے ماحول سے کوئی مدد نہ ملے گی، بلکہ ماحول کے مختلف اثرات اس کیفیت کو بڑھانے کے بجائے اُلٹا گھٹا دیں گے۔ لیکن اگر وہی کیفیت پورے ماحول پر طاری ہو۔ اگر تمام لوگ ایک ہی خیال اور ایک ہی ذہنیت کے ماتحت ایک ہی عمل کر رہے ہوں تو معاملہ برعکس ہوگا۔ اس وقت ایک ایسی اجتماعی فضا بن جائے گی جس میں پوری جماعت پر وہی ایک کیفیت چھائی ہوئی ہوگی اور ہر فرد کی اندرونی کیفیت ماحول کی خارجی اعانت سے غذا لے کر بے حد وحساب بڑھتی چلی جائے گی۔ ایک شخص اکیلا برہنہ ہو اور گرد و پیش سب لوگ کپڑے پہنے ہوئے ہوں تو وہ کس قدر شرمائے گا؟ بے حیائی کی کتنی بڑی مقدار اس کو برہنہ ہونے کے لیے درکار ہوگی اور پھر بھی ماحول کے مختلف اثرات سے اس کی شدید بے حیائی بھی کس طرح بار بار شکست کھائے گی؟ لیکن جہاں ایک حمام میں سب ننگے ہوں وہاں شرم بے چاری کو پھٹکنے کا موقع بھی نہ ملے گا۔ اور ہر شخص کی بے شرمی دوسروں کی بے شرمی سے مدد پا کر افزوں در افزوں ہوتی چلی جائے گی۔ ایک ایک سپاہی کا الگ الگ جنگ کرنا اور مہالک جنگ برداشت کرنا کس قدر مشکل ہے؟ مگر جہاں فوج کی فوج ایک ساتھ مارچ کر رہی ہو وہاں جذبات شہامت وحماست کا ایک طوفان اُمنڈ آتا ہے جس میں ہر سپاہی مستانہ وار بہتا چلا جاتا ہے۔ نیکی ہو یا بدی، دونوں کی ترقی میں اجتماعی نفسیات کو غیر معمولی دخل حاصل ہے۔ جماعت مل کر بدی کر رہی ہو تو فحش، بے حیائی اور بدکاری کے جذبات اُبل پڑتے ہیں اور جماعت مل کر نیکی کی رہی ہو تو پاکیزہ خیالات اور نیک جذبات کا سیلاب آ جاتا ہے جس میں بد بھی نیک بن جاتے ہیں، خواہ تھوڑی دیر کے لیے سہی۔

اجتماعی روزے کا مہینہ قرار دے کر رمضان سے شارع نے یہی کام لیا ہے۔ جس طرح آپ دیکھتے ہیں کہ ہر غلہ اپنا موسم آنے پر خوب پھلتا پھولتا ہے اور ہر طرف کھیتوں میں چھایا ہوا نظر آتا ہے، اسی طرح رمضان کا مہینہ گویا خیر وصلاح اور تقویٰ وطہارت کا موسم ہے۔ جس میں برائیاں دبتی ہیں، نیکیاں پھلتی ہیں، پوری پوری آبادیوں پر خوفِ خدا اور حبِ خیر کی روح چھا جاتی ہے، اور ہر طرف پرہیزگاری کی کھیتی سرسبز نظر آنے لگتی ہے۔ اس زمانہ میں گناہ کرتے ہوئے آدمی کو شرم آتی ہے، ہر شخص خود گناہوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے کسی دوسرے بھائی کو گناہ کرتے دیکھ کر اسے شرم دلاتا ہے، ہر ایک کے دل میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ کچھ بھلائی کا کام کرے، کسی غریب کو کھانا کھلائے، کسی ننگے کو کپڑا پہنائے، کسی مصیبت زدہ کی مدد کرے، کہیں کوئی نیک کام کر رہا ہو تو اس میں حصّہ لے، کہیں کوئی بدی ہو رہی ہو تو اسے روکے۔ اس وقت لوگوں کے دل نرم ہو جاتے ہیں، ظلم سے ہاتھ رُک جاتے ہیں، بُرائی سے نفرت اور بھلائی سے رغبت پیدا ہو جاتی ہے، توبہ اور خشیت وانابت کی طرف طبیعتیں مائل ہوتی ہیں، نیک بہت نیک ہو جاتے ہیں اور بد کی بدی اگر نیکی میں تبدیل نہیں ہوتی تب بھی اس جلاب سے اس کا اچھا خاصہ تنقیہ ضرور ہو جاتا ہے۔ غرض اس زبردست حکیمانہ تدبیر سے شارع نے ایسا انتظام کر دیا ہے کہ ہر سال ایک مہینہ کے لیے پوری اسلامی آبادی کی صفائی ہوتی رہے، اس کو اوور ہال کیا جاتا رہے، اس کی کایا پلٹی جائے۔ اور اس میں مجموعی حیثیت سے روحِ اسلامی کو از سرِ نو زندہ کر دیا جائے۔ اسی بنا پر نبی ﷺ نے فرمایا:

> جب رمضان کی پہلی تاریخ آتی ہے تو شیاطین اور سرکش جن باندھ دیے جاتے ہیں۔ دوزخ کی طرف جانے کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں۔ ان میں سے کوئی دروازہ کھلا نہیں رہتا۔ اور جنت کی طرف جانے کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔ ان میں سے کوئی دروازہ بند نہیں رہتا۔ اس وقت پکارنے والا پکارتا ہے:
>
> ’’اے بھلائی کے طالب آگے بڑھ اور اے برائی کے خواہش مند ٹھہر جا‘‘۔

سکتہ کے مریض کا آخری امتحان اس طرح کیا جاتا ہے کہ اس کی ناک کے پاس آئینہ

رکھتے ہیں۔ اگر آئینہ پر کچھ دھندلاہٹ سی پیدا ہو تو سمجھتے ہیں کہ ابھی جان باقی ہے، ورنہ اس کی زندگی کی آخری اُمید بھی منقطع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی کسی بستی کا تمھیں امتحان لینا ہو تو اسے رمضان کے زمانہ میں دیکھو۔ اگر اس مہینہ میں اس کے اندر کچھ تقویٰ، کچھ خوفِ خدا، کچھ نیکی کے جذبہ کا اُبھار نظر آئے تو سمجھو ابھی زندہ ہے۔ اور اگر اس مہینہ میں بھی نیکی کا بازار سرد ہو، فسق و فجور کے آثار نمایاں ہوں، اور حس مردہ نظر آئے تو اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ؁۱۵۶ [البقرہ ۲: ۱۵۶] پڑھ لو۔ اس کے بعد زندگی کا کوئی سانس ''مسلمان'' کے لیے مقدر نہیں ہے۔

۲۔ اجتماعی احساس

اجتماعی عمل کا دوسرا اہم فائدہ یہ ہے کہ اس سے لوگوں میں فطری اور اصلی وحدت پیدا ہوتی ہے۔ نسل یا زبان یا مرز بوم یا معاشی اغراض کا اشتراک فطری قومیت پیدا نہیں کرتا۔ آدمی کا دل صرف اسی سے ملتا ہے، جو خیالات اور عمل میں اس سے ملتا ہو۔ یہ اصلی رشتہ ہے جو دو آدمیوں کو ایک دوسرے سے باندھتا ہے۔ اور جس کے ساتھ خیالات اور عمل میں اتفاق نہ ہو۔ اس سے کبھی دل نہیں ملتا، خواہ دونوں ایک ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہوں۔ جب کوئی شخص اپنے گرد و پیش کے لوگوں کو ذہنیت اور عمل میں اپنے سے مختلف پاتا ہے تو صریح طور پر اپنے آپ کو ان کے درمیان اجنبی محسوس کرتا ہے۔ مگر جب بہت سے لوگ مل کر ایک ہی ذہنی کیفیت کے ساتھ ایک ہی عمل کرتے ہیں تو ان میں باہم یگانگت، رفاقت، یک جہتی اور برادری کے گہرے تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں، ان کے درمیان کوئی اجنبیت باقی نہیں رہتی، قلب و روح کا اشتراک اور عمل کا اتفاق ان کو آپس میں جوڑ کر ایک کر دیتا ہے۔

خواہ نیکی ہو یا بدی، دونوں صورتوں میں اجتماعی نفسیات اسی طرح کام کرتی ہے۔ چوروں میں چوری کا اشتراک اور شرابیوں میں شراب نوشی کا اشتراک بھی یونہی برادری پیدا کرتا ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ بدی کے راستہ میں افراد کی نفسانیت کا دخل رہتا ہے جس کا فطری میلان خود فرد کو پھاڑ کر الگ کر دینے کی طرف ہے۔ اس لیے ایسے راستوں میں برادری کبھی بے آلائش

اور مستحکم نہیں ہوتی۔ بخلاف اس کے نیکی کے راستے میں نفسانیت دبتی ہے، انسانی روح کو حقیقی تسکین ملتی ہے، اور پاک جذبات کے ساتھ آدمی اس راستہ پر چلتا ہے۔ اس لیے نیک خیالات اور نیک عمل کا اشتراک وہ بہترین رشتہ اخوت پیدا کرتا ہے جس سے زیادہ مستحکم اجتماعی رابطہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

نماز باجماعت کی طرح رمضان کے اجتماعی روزے مسلمانوں میں اسی نوع کی برادری پیدا کرتے ہیں۔ تمام لوگوں کا مل کر ایک خدا کی رضا چاہنا، اسی کی رضا کے لیے بھوک پیاس کی تکلیف اٹھانا، اسی کے خوف سے برائیوں کو چھوڑنا اور ایک دوسرے کو برائیوں سے روکنا، اسی کی محبت میں بھلائیوں کی طرف دوڑنا اور ایک دوسرے کو بھلائی پر اُکسانا، یہ چیز ان میں بہترین قسم کی وحدت، صحیح ترین فطری قومیت، پاکیزہ ترین اجتماعی ذہنیت اور ایسی ہمدردی و رفاقت پیدا کرتی ہے جو ہر کھوٹ سے خالی ہے۔

۳۔ امدادِ باہمی کی روح

اس اجتماعی عبادت کا تیسرا زبردست کام یہ ہے کہ یہ عارضی طور پر تمام لوگوں کو ایک سطح پر لے آتی ہے۔ اگرچہ امیر امیر ہی رہتا ہے اور غریب غریب، لیکن روزہ چند گھنٹوں کے لیے امیر پر بھی وہ کیفیت طاری کر دیتا ہے، جو اس کے فاقہ کش بھائی پر گزرتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کی مصیبت حقیقی طور پر محسوس کرتا ہے، اور خدا کی رضا چاہنے کا جذبہ اسے غریب بھائیوں کی مدد کرنے پر اُکساتا ہے۔ بظاہر یہ ایک بڑی چھوٹی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس کے اخلاقی و تمدنی فوائد بے شمار ہیں۔ جس قوم کے امیروں میں غریبوں کی تکالیف کا احساس اور ان کی عملی ہمدردی کا جذبہ ہو، اور جہاں صرف اداروں ہی کو خیرات نہ دی جاتی ہو، بلکہ فرداً فرداً بھی حاجت مندوں کو تلاش کر کے مدد پہنچائی جاتی ہو، وہاں سے نہ صرف یہ کہ قوم کے کمزور حصے تباہ ہونے سے محفوظ رہتے ہیں، نہ صرف یہ کہ اجتماعی فلاح برقرار رہتی ہے، بلکہ غربت اور امارت میں حسد کے بجائے محبت کا، شکر گزاری اور احسان مندی کا تعلق قائم ہوتا ہے اور وہ

طبقاتی جنگ کبھی رونما نہیں ہوسکتی، جو ان قوموں میں ہوتی ہے جن کے مالدار لوگ جانتے ہی نہیں کہ فقر و فاقہ کیا چیز ہوتی ہے، جو قحط کے زمانہ میں تعجب سے پوچھتے ہیں کہ لوگ بھوکے کیوں مر رہے ہیں۔ انھیں روٹی نہیں ملتی تو یہ کیک کیوں نہیں کھاتے؟

یہ اسلام کا دوسرا عملی رکن ہے، جس کے ذریعہ سے اسلام اپنے افراد کو فرداً فرداً ایک خاص قسم کی اخلاقی تربیت دے کر تیار کرتا ہے اور پھر انھیں جوڑ کر ایک خاص طرز کی جماعت بناتا ہے۔ اسلام کا آخری مقصد جس مدنیت صالحہ اور حکومت الٰہیہ کو وجود میں لانا ہے، اس کے اجزائے ترکیبی اس طرح نماز اور روزے کے ذریعہ سے چھیل بنا کر تیار کیے جاتے ہیں۔ اس کے اہل کار، عہدہ دار اور وزرا، اس کے معلم اور پروفیسر، اس کے قاضی اور مفتی، اس کے تاجر، مزدور، کارخانہ دار اور کسان، اس کے رائے دہندے، نمائندے اور شہری، سب اس تربیت کے بعد کہیں اس قابل ہوتے ہیں کہ ان کے اجتماع سے وہ صالح، تمدنی و سیاسی نظام بن سکے جسے ''خلافت علیٰ منہاج النبوۃ'' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ محض ان گھڑ افراد کو لے کر خلافت الٰہیہ قائم کرنے کے لیے دوڑ جانا، ایسی خام خیالی و خامکاری ہے جس سے اللہ اور اس کا رسول ﷺ بری ہیں۔ [۱]

❖❖❖

[۱]۔ اخذ و ترتیب: صلاح الدین کاشمیری

رمضان کی حقیقت

سیّد سلمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

یہ مادی عالم جس طرح مادی نظام اور قانون کا پابند ہے، خدائے پاک نے عالم روحانی میں بھی اسی قسم کا ایک اور نظام، قانون اور علل واسباب کا سلسلہ قائم کر رکھا ہے۔ جس یقین کے ساتھ آپ یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ زہر انسان کے لیے قاتل ہے، اسی یقین کے ساتھ طب روحانی کا واقف کار کہتا ہے کہ گناہ انسان کی روح کو قتل کر دیتا ہے۔ پیغمبر فیضانِ نبوت کے قبول کے لیے اپنی روح میں کس طرح استعداد پیدا کرتا ہے، دُنیا میں کب مبعوث ہوتا ہے، معجزات کا ظہور اس سے کن اوقات میں ہوتا ہے، اور اپنے دعویٰ کو وہ کس طرح پیش کرتا ہے، انکار و مزاحمت پر وہ کیونکر مہاجرۃ الی اللّٰہ کرتا ہے، اور ان میں سے ہر ایک چیز مرتب اور منظم قواعد کے مطابق بہ ترتیب ظہور میں آتی ہے۔ قرآن مجید میں تیرہ مقام پر ''سنۃ اللّٰہ'' کا لفظ آیا ہے، لیکن ان میں زیادہ تر اسی روحانی نظام و ترتیب کی طرف اشارہ ہے۔

فلسفہ تاریخ جس طرح سیاسی واقعات کی تکرار اور حوادث کے بار بار اعادہ سے اصول اور نتائج تک پہنچ کر ایک عام تاریخی قانون بنالیتا ہے، بعینہٖ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے سوانح اور تاریخیں بھی اپنے واقعات کے بار بار اعادہ سے خصائص نبوت کا اصول قانون ہمارے لیے مرتب کرتی ہیں۔

پیغمبرانہ تاریخ کے ان ہی اصول وقوانین میں سے ایک یہ ہے کہ نبی جب اپنے کمالِ انسانیت کو پہنچ کر فیضانِ نبوت کے قبول اور استعداد کا انتظار کرتا ہے، تو وہ ایک مدت تک کے لیے

عالمِ انسانی سے الگ ہو کر ملکوتی خصائص میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ اسی وقت سے اس کے دل و دماغ میں وحی الٰہی کا سر چشمہ موجیں مارنے لگتا ہے۔ کوہِ سینا کا پُرجلال پیغمبر (حضرت موسیٰ علیہ السلام) جب توراۃ لینے جاتا ہے تو چالیس شبانہ روز بھوکا اور پیاسا رہتا ہے[1] کوہ سعیر کا مقدس آنے والا (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) اس سے پہلے کہ اس کے منہ میں انجیل کی زبان گویا ہو، وہ چالیس روز و شب بھوکا اور پیاسا رہا۔[2] اسی طرح فاران کا آتشیں شریعت والا پیغمبر (آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نزولِ قرآن سے پہلے پورے ایک مہینہ حراء نامی مکہ کے ایک غار میں ہر قسم کی عبادتوں میں مصروف رہتا ہے اور بالآخر اِسی اثناء میں ناموسِ اکبر اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝۱ (العلق ۹۶: ۱) کا مژدہ جانفزاء لے کر نمودار ہوتا ہے۔[3]

یہ واقعہ کس ماہِ مبارک کا تھا؟

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ (البقرہ ۲: ۱۸۵)

رمضان کا وہ مہینہ جس میں قرآن اترا۔

یہ کس شب اقدس کی داستان ہے؟

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ (الدخان ۴۴: ۳)

ہم نے قرآن کو ایک برکت والی رات میں اُتارا۔

اس مبارک شب کو ہم کس نام سے جانتے ہیں؟

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝۱ (القدر ۹۷: ۱)

ہم نے قرآن کو شب قدر میں اُتارا۔

ان آیتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رمضان وہ مقدس مہینہ ہے جس میں قرآن سب سے

۱۔ خروج ۳۴: ۲۸

۲۔ متی ۴: ۲

۳۔ صحیح بخاری حدیث بدء الوحی، ایک ماہ کا بیان صحیح مسلم کتاب الایمان باب بدء نزول وحی میں اور سیرت ابن ہشام بدء بعث میں ہے۔

پہلی بار دُنیا میں نازل ہوا، اور پیغمبر امی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عالم کی رہنمائی اور انسانوں کی دستگیری کے لیے دستور نامہ الٰہی کا سب سے پہلا صفحہ عنایت کیا گیا۔ قرآن کا حامل اور اس وحی الٰہی کا مہبط ان دنوں ایک غار کے کونے میں یکہ وتنہا، بھوکا اور پیاسا سر بہ زانو تھا۔ اس بنا پر اس ماہِ مقدس میں بھوکا اور پیاسا رہنا (روزہ)، کسی عبادتگاہ میں یکہ وتنہا (اعتکاف)، نزول وحی کی رات میں (لیلۃ القدر) بیدار و سر بسجود رہنا، تمام پیروانِ محمدی ﷺ کے لیے ضروری تھا کہ:

اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران ۳:۳۱)

اگر تم خدا کو پیار کرتے ہو تو میری پیروی کرو، خدا تمھیں پیار کرے گا۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ روزہ، اعتکاف اور لیلۃ القدر کی حقیقت اسلام میں کیا ہے، اور رمضان مبارک میں روزوں کی تخصیص اسلام میں کس بنا پر ہے۔ اس لیے اس ماہ اقدس میں بقدر امکان ان ہی حالات وجذبات میں متکیف ہونا چاہیے، جس میں وہ حامل قرآن متکیف تھا، تاکہ وہ دُنیا کی ہدایت یابی، اور رہنمائی کی یادگار تاریخ ہو۔ یہ کیفیات وحالات جن کو قرآن کے مبلغ کی پیروی میں ہم اپنے اُوپر طاری کرتے ہیں، یہی اس ہدایت کے ملنے پر ہماری شکرگزاری اور خدا کی بڑائی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس روزہ کی فرضیت سے سب سے پہلا مقصد انبیاء علیہم السلام کے ان متبرک ومقدس ایام کی تقلید اور پیروی ہے۔ یہودی بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیروی میں ۴۰ دنوں کا روزہ مناسب، اور صرف چالیسویں دن کا روزہ فرض سمجھتے ہیں۔ عیسائیوں کو بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تقلید اور پیروی میں یہی چاہیے تھا، مگر انھوں نے پال کی پیروی میں جس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام

۱- روایات سے اگرچہ بتصریح یہ نہیں معلوم ہوتا کہ آپ غارِ حرا میں روزے رکھتے تھے۔ تاہم قرائن واشارات سے سمجھا جاتا ہے کہ آپ ﷺ اور عبادات کے ساتھ غارِ حراء میں روزے بھی رکھتے تھے، جیسا کہ بخاری (بدء الوحی) اور سیرۃ ابن ہشام سے واضح ہے کہ آپ ان دنوں میں تحنث اور اعتکاف کرتے تھے، جس کا ایک جزو روزہ ہے، آج کل کے بعض علمائے مصنفین نے بھی ان قرائن سے یہی سمجھا ہے کہ آپ ﷺ دنوں روزہ سے رہتے تھے۔ (دیکھو، خضری مصری کی التشریح الاسلامی ۶ و ۴۳)

کے احکام وسنن کی اتباع نہین کی، اس کی بھی نہ کی۔ اسی طرح مسلمانوں کو بھی یہ حکم ہوا کہ وہ اپنے رسول ﷺ کی پیروی میں یہ چند دن اسی طرح گزاریں، چنانچہ فرمایا:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ

(البقرہ۲:۱۸۳)

اے مسلمانو! جیسے تم سے پہلے لوگوں پر (ان کے رسولوں کی پیروی، اور ہدایت ملنے کے شکریہ میں) روزہ فرض کیا گیا تھا، تم پر بھی فرض کیا گیا۔

دین الٰہی کی تکمیل، نبوت کے اختتام اور تعلیم محمدی ﷺ کے کمال کی یہ بھی بڑی دلیل ہے کہ گذشتہ اُمتوں نے اپنے اپنے پیغمبروں کی تقلید اور پیروی کے جس سبق کو چند ہی روز میں بھلا دیا، محمد رسول اللہ ﷺ کی لاکھوں اور کروڑوں اُمت اس کو اب تک یاد رکھے ہوئے ہے، اور اپنے رسول ﷺ کی پیروی میں وہ بھی ایک مہینہ تک اسی طرح دن کو کھانے پینے اور دوسری نفسانی خواہشوں سے اپنے کو پاک رکھتی اور ملکوتی زندگی بسر کرتی ہے۔

یہ روزہ انبیاء علیہم السلام کی صرف پیروی اور تقلید ہی نہیں، بلکہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے اس عظیم الشان احسان کا، جو اس نے پیغمبر صادق کے ذریعہ انسانوں پر کیا، شکریہ ہے اور اس کی احسان شناسی کا احساس ہے۔ وہ کتابِ الٰہی، وہ تعلیم ربانی، وہ ہدایت روحانی، جو ان ایام میں انسانوں کو عنایت ہوئی، جس نے ان کو شیطان سے فرشتہ اور ظلماتی سے نورانی بنایا، پستی وذلت کے عمیق غار سے نکال کر ان کو اوجِ کمال تک پہنچایا، ان کی وحشت کو تہذیب واخلاق سے، ان کی جہالت کو علم ومعرفت سے، ان کی نادانی کو حکمت ودانائی سے، اور ان کی تاریکی کو بصیرت اور روشنی سے بدل دیا، جس نے ان کی قسمتوں کے پانسے اُلٹ دیئے اور فضل ودولت اور خیر وبرکت کے خزانوں سے ان کے کاشانوں کو معمور کر دیا، جس نے ذرۂ بے مقدار کو آفتاب اور مشت خاک کو ہمدوش ثریا بنا دیا، قرآن پاک اپنے ان الفاظ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

''اور (یہ رمضان کا روزہ) اس لیے (فرض ہوا) تاکہ تم اللہ کی بڑائی کرو کہ تم کو اس نے ہدایت دی، اور تاکہ تم اس کا شکریہ ادا کرو''۔

اس ہدایت ربانی اور کتابِ الٰہی کے عطیہ پر شکرگزاری کا یہ رمز داشارہ ہے کہ اس مہینہ کی راتوں میں مسلمان اس پوری کتاب کو نمازوں (تراویح) میں پڑھتے اور سنتے ہیں، اور اس مہینہ کے خاتمہ پر اللہ اکبر! اللہ اکبر! کا ترانہ بلند کرتے ہوئے عیدگاہوں میں جاتے اور خوشی ومسرت کے ولولوں کے ساتھ عید کا دوگانہ شکر ادا کرتے ہیں۔[1]

❖❖❖

---

[1] سید سلیمان ندوی، سیرۃ النبی ﷺ، جلد پنجم، ص ۲۲۶-۲۶۸، ۲۸۸-۲۸۹

روزہ اور ترکِ گناہ

مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روزے دار کے حق میں ارشاد فرمایا ہے:

جس شخص نے قولِ باطل اور اس پر عمل کرنا ترک نہ کیا تو اللہ تعالیٰ کو اس کے بھوکے رہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔[۱]

طاعات (بندگی) کا صحیح ہونا اور نیکیوں کا قبول ہونا، اس پر موقوف نہیں کہ گناہ کو بالکل چھوڑ دیا جائے لیکن گناہوں کی موجودگی میں طاعات کی برکت ضرور کم ہوجاتی ہے۔ اگر کوئی نماز بھی پڑھتا ہو اور غیبت بھی کرتا ہو تو یہ نہ کہیں گے کہ غیبت کی وجہ سے نماز صحیح نہیں ہوئی، جیسا کہ بعض لوگ جب گناہ نہیں چھوڑتے تو، طاعت ترک کر دیتے ہیں۔ ایک شخص سے مرتے وقت کہا گیا کہ کلمہ پڑھ لے، مگر اس نے کہا کہ ایک کلمے سے کیا ہوگا، میرے گناہوں کی پوٹ اتنی ہے کہ ایک کلمہ اس کو میرے سر سے اتار نہیں سکتا۔ آخر اسی طرح اس کا خاتمہ ہوگیا۔ اس طرح کی مایوسی سے بچنے کے لیے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اگر گناہ بھی کرے اور طاعت بھی، تو دونوں کی سزا و جزا الگ الگ ہے۔ اس لیے جتنی طاعت بھی کر سکے اس کو ترک نہیں کرنا چاہیے۔

حدیث کا مضمون یہ ہے کہ جو شخص روزے کے دوران جھوٹ اور بُرے کاموں کو نہ چھوڑے، تو اللہ تعالیٰ کو کوئی ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔ یعنی جب گناہ کی بات اور گناہ کا

۱۔ بخاری، ج ۱، ص ۲۵۵

کام نہ چھوڑا تو روزے کا کیا فائدہ ہوا! مقصود یہ ہے کہ ہر چند کہ ثواب ملتا ہے، مگر نیک کاموں کی برکت کم ہو جاتی ہے، مثلاً غیبت کی اور پھر نماز بھی پڑھی، تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ نماز کا ثواب نہیں ملا، لیکن نماز کی برکت ضرور کم ہو جائے گی۔ جو نورانیت غیبت کے ترک کی حالت میں نماز کے اندر ہوتی ہے، وہ نورانیت ارتکابِ غیبت کے بعد نہ ہو گی۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے ایک تندرست آدمی غذا کھائے تو نافع اور مقوی ہو گی اور ایک مریض کھائے جس کا معدہ خراب ہے تو زیادہ مفید نہ ہو گی، اگرچہ کم و بیش اثر ضرور ہو گا۔ لہٰذا گناہوں کو چھوڑنے کے بعد جو نیک کام ہوں گے، ان میں زیادہ برکت ہو گی۔

روزے کے آدابِ ضروریہ میں یہ بات بھی شامل ہے کہ جیسے کھانے پینے سے منہ بند رکھتے ہیں، اسی طرح دوسرے گناہوں کو بھی بالکل ترک کر دیں۔ عجیب بات ہے کہ لوگ روزے میں کھانے پینے اور صحبت کے ترک کو تو ضروری سمجھتے ہیں لیکن گناہ کے ترک کو ضروری نہیں سمجھتے حالانکہ وہ تینوں کام ایسے ہیں کہ دوسرے اوقات میں حلال بھی تھے اور رمضان میں بھی رات کے وقت جائز ہیں۔ جب روزے کی وجہ سے بعض حلال کام بھی حرام ہو گئے تو جو اعمال ہر وقت حرام ہیں، ان کا ترک روزے میں کیوں ضروری نہ ہو گا۔ پس اگر کسی نے روزے میں غیبت کی اور بری نگاہ سے دیکھا تو یہ تو نہ کہیں گے کہ اس کا روزہ نہیں ہوا، مگر یہ کہیں گے کہ روزے کی برکت جاتی رہی۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۞ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۞

(الزلزال۹۹: ۷۔۸)

پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہو گی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہو گی وہ اس کو دیکھ لے گا۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی حاکم اپنے فرائض منصبی اچھی طرح انجام دے اور رشوت بھی لے، اور اگر حکام بالا کو اطلاع ہو جائے تو رشوت ستانی پر سزا تو ملے گی لیکن جتنا کام کیا تھا، اس کی تنخواہ بھی ملے گی۔

اس پر تو سب کا اجماع ہے کہ گناہ کرنے سے روزہ باطل نہیں ہوگا اور اس کی قضا نہیں کرنا پڑے گی۔ پس معلوم ہوا کہ اس حدیث کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ روزہ نہ ہوگا، کوئی اور معنی ہیں۔ سو وہ یہی ہیں کہ حق تعالیٰ کو زیادہ توجہ اس ترکِ طعام پر نہ ہوگی۔ گناہوں کے ساتھ ساتھ جو طاعت کی جاتی ہے، اس سے وہ نور، شگفتگی اور مسرت نہیں محسوس ہوتی جو نیکی سے حاصل ہونا چاہیے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے بہت لذیذ کھانا پکایا اور اس میں تھوڑی راکھ بھی جھونک دی، جس سے مزا کرکرا ہوگیا۔

گناہ کو طاعت سے دو قسم کا علاقہ (نسبت) ہے۔ بعض گناہ تو وہ ہیں کہ وہ نیکیوں کو ضائع کر دیتے ہیں اور ان کی موجودگی میں کوئی نیک عمل صحیح ہوتا ہی نہیں، مثلاً کفر اور ایذاءِ رسول ﷺ اور احسان کرنے کے بعد اس کو جتانا اور تکلیف پہنچانا۔ ہمارا یہ دعویٰ کہ گناہوں کے ساتھ بھی نیکی قبول ہوتی ہے، وہ ایسے گناہوں کے متعلق نہیں ہے۔ یہاں صرف وہ معاصی مراد ہیں جن کے وجود کو طاعت کے وجود یا بقا میں دخل نہ ہو۔ ایسے گناہوں کے بارے میں دعویٰ کرتا ہوں کہ ان سے نیکیاں ضائع نہیں ہوتیں، برکت جاتی رہتی ہے، جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

”اگر گناہوں سے نہ بچے تو کھانا پینا چھوڑنے کا کیا فائدہ!“

اب اس حدیث کے مقصود پر غور کرنے کی ضرورت ہے، یعنی یہ کہ گناہ کے ترک کا اہتمام بالخصوص روزے میں ضروری ہے۔ ہر مسلمان جانتا ہے کہ گناہ بُرا ہے تو کم از کم مہینہ بھر کے لیے تو گناہ چھوڑ دو۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس مہینے کے بعد گناہ کرنے کی اجازت ہے کیونکہ نفس سے وعدہ لینا مشکل ہے۔ اس واسطے میں نے یہ کہا کہ ایک مہینے کے لیے گناہ نہ کرنے کا عہد کر لو۔ اس میں آسانی ہوتی ہے اور ہمیشہ کے لیے تنبہ (نصیحت/آگاہی) ہو جاتا ہے۔ ایک بزرگ نے اپنے نفس سے یہ صلح کر لی تھی کہ ایک گھنٹہ ذکر کر لو، اس کے بعد پھر ایک گھنٹے کے لیے، اسی طرح مدتوں مشغول رہے۔ پس نفس سے یہ کہہ دو کہ رمضان تک کوئی گناہ نہ کرے

اور صرف ایک مہینے کا عہد اس سے لو۔ پھر اس کے بعد، میرا یقین ہے کہ، رمضان تقویٰ کی حالت میں گزر گیا تو پھر یہ تقویٰ ان شاء اللہ نہ ٹوٹے گا۔ غرض اس ماہ کے لیے سب گناہ چھوڑ دو۔ زبان کے گناہ بھی، جیسے گالیاں دینا، غیبت، شکایت کرنا، کسی ناجائز مضمون کا پڑھنا--- کان کے گناہ بھی جیسی گالیاں سننا، گانا سننا---ہاتھ کے گناہ بھی، جیسے ناچ کی مجلس میں جانا، جھوٹے مقدمے کی پیروی کے لیے جانا، جھوٹی شہادت کے لیے جانا اور سب سے بڑھ کر پیٹ کے گناہ جیسے رشوت کا، سود کا اور غصب کے مال کا کھانا۔

غرض رمضان میں ہر قسم کے گناہ بالکل چھوڑ دو، پھر ان شاء اللہ تعالیٰ وہ روزہ، مبارک روزہ ہوگا اور پھر وہ تمھاری شفاعت کرے گا اور وہ روزہ ہوگا جس کے بارے میں اللہ فرماتے ہیں: انا اجزی بہ (میں خود اس کا بدلہ دیتا ہوں)۔ اور اگر گناہ نہ چھوڑے تو روزہ تو ہوگا لیکن ایسا ہوگا کہ جیسے تم کسی اپنے دوست سے کہو کہ ہم کو ایک آدمی لا دو اور وہ کسی ایسے آدمی کو لا دے کہ اس کے کان بھی نہ ہوں، آنکھ بھی نہ ہو، لنگڑا بھی ہو، لنجا بھی ہو، بات بھی نہ کر سکتا ہو، تو یہ شخص آدمی تو ضرور ہے، لیکن بے کار۔ صرف ایک سانس کے چلنے کی وجہ سے اس کے حیوان ناطق کہیں گے۔ تو جیسے یہ شخص آدمی ہے بھی اور نہیں بھی، ایسا ہی یہ روزہ ہے بھی اور نہیں بھی۔ اور یہ روزہ اس قابل ہے کہ اس کو دفن کر دیا جائے۔

اب ختم کرتا ہوں۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا میں کہہ چکا۔ خدا تعالیٰ سے دُعا کیجیے کہ توفیق عطا فرمائے۔[1]

❖❖❖

---

[1] مفاسد گناہ سے ماخوذ۔ تدوین: عارفہ اقبال

عشرۂ اعتکاف اور شبِ قدر

مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

اللہ تعالیٰ نے شریعت مقدسہ میں ایک خاص خلوت مقدر فرمائی ہے اور ایک بڑے زمانہ میں چھوٹا سا زمانہ اس خلوت کے لیے مشروع فرمایا ہے یعنی رمضان المبارک کا آخری عشرہ۔ اور اس خلوت کا نام اعتکاف رکھا ہے، خلوت نہیں رکھا، اس لیے کہ یہ فلاسفہ اور حکما کا دیا ہوا نام ہے۔

اعتکاف کی روح کیا ہے؟ اعتکاف کی روحِ مجاہدہ کا ایک جزو ہے۔ مجاہدہ کی حقیقت تھی: قلة الطعام (کم کھانا) قلة المنام (کم سونا) قلة الکلام (کم بولنا) قلة الاختلاط مع الانام (لوگوں سے کم میل جول رکھنا)۔ مجاہدہ کا ایک جزو یعنی لوگوں سے کم ملنا تھا، نہ ملنا نہیں بلکہ کم ملنا۔ یہ غلطی کی جوگیہ نے اور حکمائے اشراقین نے کہ وہ ترکِ اختلاط (ملنے کے چھوڑنے) ہی کو مجاہدہ سمجھے اور اس کی مضرت انھیں یہ ہوئی کہ تعلیم و تعلم سے محروم ہو گئے۔ اس اُمت کی خلوت در انجمن (محفل میں تنہائی) ہے ؂

گر با ہمہ چو بامنی بے ہمہ	گر بے ہمہ چو بے منی با ہمہ

اگر تم مخلوق میں مشغول ہو مگر دل ہماری طرف متوجہ ہے تو تم خلوت نشین ہی ہو۔

اور اگر خلوت نشین ہو کر تمہارا دل مخلوق کی طرف متوجہ ہے تو خلوت نشین نہیں ہو۔

اِسی کو زیادہ تفصیل سے عارف شیرازی کہتے ہیں ؂

چو ہر ساعت از تو بجائے رود دل	بہ تنہائی اندر صفائی نہ بینی

جب تمھارا دل ہر گھڑی ایک جگہ جاتا ہے تو تم تنہائی میں صفائی نہیں حاصل کر سکتے۔

درت مال وجاہ است وزرع وتجارت	چو دل باخدا ایست خلوت نشینی

اور اگر تمہارے پاس مال ودولت ہے اور تجارت وزراعت کرتے ہو، جب دل خدا سے لگاؤ رکھتا ہے تو خلوت نشین ہی ہو۔

یعنی اگر تم سب کے پاس بیٹھے ہو مگر قلب میری طرف متوجہ ہے تو میرے ساتھ ہو۔ یہ ہے اس اُمت کی خلوت کہ جلوت میں خلوت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اعتکاف کو مساجد میں مشروع فرمایا ہے۔ مخاطبین میں بعض ایسے تھے کہ یہ سن کر دس روز تک مسجد میں رہیں گے، نفس کو مزہ آیا کہ آہا خوب باتیں گھڑیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا اس طرح انسداد فرمایا کہ مسجد میں ایک چٹائی کا حجرہ بنایا اور اس میں رہے۔ فرمایا کہ مسجد میں اس طرح رہنا چاہیے اور یہی ماخذ ہے اس عادت کا کہ پردہ وغیرہ اعتکاف میں باندھ لیتے ہیں۔ لیکن اس میں بھی شاید کوئی غلو کرتا۔ اس لیے کہ یہ ایک امتیاز کی شان ہے کہ حجرہ میں خود بیٹھے رہیں اور باہر مریدین ومعتقدین جمع ہیں کہ شاہ صاحب نکلیں گے تو زیارت کریں گے اور باتیں کریں گے۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا یہ انتظام فرمایا کہ نماز کے وقت، کہ وہی وقت اجتماع کا ہے، خود بخود باہر رونق افروز ہو گئے۔ اسی بنا پر اہل اعتکاف کا طریقہ ہے کہ نماز کے وقت پردہ وغیرہ سب اُٹھا دیتے ہیں تاکہ کوئی امتیاز کی شان پیدا ہو کر عجب نہ ہو۔ واللہ اگر تمام جہان کے عقلاً چاہتے کہ ان مصالح کی رعایت کریں تو ہرگز نہ کر سکتے۔ یہ نور وحی ہے کہ جو ایسے دقیق دقیق مصالح کی رعایت فرمائی۔

علاوہ اس کے ایک اور دقیق رعایت یہ کہ اس پر نظر فرمائی کہ رات کو کام زیادہ کرنا چاہیے لیکن رات آرام کا وقت ہے۔ اگر دس کی دس راتیں کام کریں تو بیمار ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لیے ان راتوں کی حق تعالیٰ نے عجیب طریقہ سے تقسیم فرمائی کہ طاق راتوں کو شب قدر بنا کر بتلا دیا کہ ایک رات سوؤ اور ایک رات جاگو اور ان راتوں میں ایسی برکات رکھ دیں کہ ہزار

مہینوں کی خلوت سے وہ بات نصیب نہیں جو ان راتوں سے ہوتی ہے۔ اگر حکما اپنی عقل سے ہزار تدبیریں کرتے اور تدبیریں کرتے کرتے مر رہتے تو یہاں تک نہ پہنچ پاتے۔ اس لیے کہ اس کا ادراک کیسے ہوتا، کہ کون سے زمانہ میں کتنی برکت رکھی ہوئی ہے۔ اور اسی طرح کسی زمانہ کے اندر کوئی برکت پیدا کرنے کی بھی قدرت نہ تھی۔ یہ تو خالق الزمان کے تصرف سے برکت پیدا ہوگئی اور انھی کے بتلانے سے معلوم ہوا۔ صاحبو! یہ برکات تم کو مفت ملتی ہیں۔ دس دن نہ سہی، کم از کم تین ہی دن دُنیا کے بکھیڑے چھوڑ کر مسجد میں بیٹھ جاؤ۔ تین دن نہ سہی ایک ہی دن سہی۔ علما نے لکھا ہے کہ ایک گھنٹہ کا اعتکاف بھی مشروع ہے۔ اللہ اللہ، اگر اب بھی کوئی محروم رہے تو بہت ہی خسران کی بات ہے۔ ان کی طرف سے تو کچھ کم نہیں ہے۔ لیکن آپ بھی تو کچھ حرکت کیجیے۔ ہماری اور حق تعالیٰ کی ایسی مثال ہے جیسے بچہ اور آپ، کہ بچہ چل نہیں سکتا لیکن تم منتظر اس کے ہو کہ یہ کچھ حرکت کرے۔ جب یہ کچھ حرکت کرے تو میں اس کو گود میں اٹھا لوں گا، سنبھال لوں گا۔ اِسی طرح حق تعالیٰ دیکھتے ہیں کہ بندہ کچھ تو کرے۔ جب یہ کچھ حرکت کرتا ہے، تو ادھر سے رحمت ہوتی ہے، جذب ہوتا ہے۔ ورنہ اگر ادھر سے جذب نہ ہوتا ہو تو یہ مسافت آپ کے قطع کرنے سے قطع نہ ہوتی۔

جو چیزیں فرض و واجب ہیں ان کے آداب قرآن میں مذکور نہیں بلکہ وہاں صرف صیغہ وجوب کا استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً

أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى الَّيْلِ (البقرہ ۲: ۱۸۷)

روزوں کو رات تک پورا کرو۔ اور یہاں خود

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عَاكِفُوْنَ (البقرہ ۲: ۱۸۷)

اپنی بیویوں سے مباشرت مت کرو، جس وقت کہ تم مسجدوں میں معتکف ہو۔

فرمایا، اس میں اعتکاف کے آداب تو بتلائے مگر اس کے فرض و واجب ہونے سے سکوت فرمایا۔ ایک قسم کا اعتدال ہے کہ نہ فرض و واجب، نہ مباح، بلکہ سنت ہے۔ اگر اسے

فرض کر دیتے تو اعتدال نہ رہتا۔ اس میں یہ خاص اعتدال رکھا ہے کہ کوئی کرے اور کوئی نہ کرے اور چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود ہمیشہ کیا ہے اور نہ کرنے والوں پر ملامت بھی نہیں فرمائی۔ اس لیے محققین کا مذہب اس کے متعلق سنت موکدہ علی الکفایہ ہونے کا ہے کہ ایک کرلے سب پر بوجھ اُتر گیا۔ ایک کرلے اس کی برکت اوروں کو بھی پہنچ جائے، وہ بھی محروم نہ رہیں۔ یہ معنی ہیں سنت علی الکفایہ ہونے کے۔ غرض اعتکاف میں ہر طرح کا اعتدال ہے اور بھی بہت سی حکمتیں ہیں۔

فی المساجد کی تخصیص سے ایک اور حکمت کی طرف اشارہ ہے۔ وہ یہ کہ مساجد کو اعتکاف کے واسطے اس واسطے مقرر کیا کہ فضیلت جماعت بھی منجملہ فضیلتوں کے ہے تاکہ دونوں فضیلتیں جمع ہو جائیں، اعتکاف کی بھی اور جماعت کی بھی۔ اگر کوئی کوہ یا صحرا یا مکان کی کوئی کوٹھڑی اس کے واسطے تجویز کرتے تو یہ جماعت کی فضیلت سے محروم رہ جاتا۔ نیز اس میں ایک لطیف اشارہ اس طرف ہے کہ تم خود اس جماعت کی برکت کے محتاج ہو۔ اگر نمازی نہ ہوتے تو تم کو یہ برکت کہاں سے حاصل ہوتی۔ تم جماعت کی برکت سے محروم رہتے۔ پس طاعت کے ساتھ عجب کا بھی علاج ہو گیا۔ سبحان اللہ کیا اعتدال ہے۔ حکما کی تجویز کردہ خلوت میں یہ باتیں کہاں۔ اور جب اپنے کو برکات میں ان کا محتاج سمجھے گا تو اس کو کبر نہ ہوگا۔ خلوت اختیار کرتے ہیں کہ لوگوں کے ضرر سے بچیں۔ غرض اوروں کو حقیر سمجھنے کا جو مرض خلوت سے پیدا ہو سکتا تھا اس کا بھی علاج ہو گیا کہ جن کو یہ حقیر سمجھ کر الگ ہوا تھا وہی اہلِ برکت ہیں۔ انھی کی بدولت اسے برکت جماعت حاصل ہوئی۔ نیز اسے اس پر بھی اب ناز نہ ہوگا کہ میرے اعتکاف کی وجہ سے اور لوگوں کو برکت پہنچی۔ کیونکہ یہ خیال کرلے گا کہ اصل میں ان لوگوں کے آنے کی وجہ سے مجھے جماعت بلکہ اعتکاف کی بھی برکت حاصل ہوئی اور اس جماعت کا موقع ہونے سے مجھ کو اعتکاف کی اجازت ہوئی۔ تو اصل میں، میں بھی ان کا محتاج ہوا۔ یہ پورا علاج ہے کبر و عجب کا۔ سبحان اللہ کیسی دوا ہے کہ پرہیز بھی ہے اور دوا بھی ہے۔

اسی طرح عاکفون بھی ایک حکمت پر دلالت کر رہا ہے کہ عاکفون کے معنی حبس کے ہیں۔

عاکفون یہ بتلا رہا ہے کہ اس میں حبس نفس مقصود ہے۔اس کا صلہ کبھی عن کے ساتھ آتا ہے اور کبھی فی یا علی کے ساتھ۔ یہاں صلہ لائے فی کے ساتھ، مطلب یہ کہ نفس کو مقید کردو، مساجد میں، جو بیت اللہ ہیں۔اب معنی عَاکِفُوْنَ فِی الْمَسَاجِدِ کے یہ ہوئے کہ عَاکِفُوْنَ فِیْ بُیُوْتِ اللہِ، محبوس ہوتے ہیں وہ اللہ کے گھروں میں اور بیوت اللہ میں محبوس ہونا کس کے واسطے ہے؟ ظاہر ہے کہ اللہ کے لیے ہے۔پس حقیقت وہ ہوئی جس کو امیر خسرو نے بیان کردیا ہے ؎

خسرو غریب است و گدا افتادہ در کوئے شما	باشد کہ از بہر خدا سوئے غریباں بنگری

خسرو غریب و گدا آپ کے کوچہ میں پڑا ہوا ہے، خدا کے لیے غریبوں کی طرف بھی نظر فرمائیے۔

اور جب اعتکاف کی یہ حقیقت ہے اور حقیقت اس عنایت کے لوازم سے ہے، تو عاکفون میں یہ بھی بتادیا کہ جب تم ہمارے دروازے پر آپڑو گے تو کیا ہم تم کو محروم کردیں گے۔تو ایک حکمت اس میں یہ بھی ہے۔ایک حکمت عاکفون میں اور بتلادی ہے جو گویا روح الروح ہے۔ روح تو خلوت ہے، اور خلوت کی روح ذکر اللہ ہے۔کیونکہ حقیقت مذکورہ دال ہے۔ذکر اللہ پر بوجہ اس کے کہ جس کوچہ میں سب کو چھوڑ کر جا پڑیں گے، کیا اس کو دل سے بھلا سکتے ہیں۔پس اس کی یاد ضروری ہوئی اور اس کے ساتھ اوروں کا چھوڑنا، اور یہی حاصل ہے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کا۔ تو گویا اعتکاف میں نظر اسی پر مقصود رہے کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ۔تو حقیقت میں اعتکاف فنائے محض ہے۔تو جس نے اس نیت سے اعتکاف کیا، وہ واقعی معتکف ہے، ورنہ جو شخص بلا اس کے رہا اس کا اعتکاف بلا روح ہے۔

پھر یہ رحمت دیکھیے کہ اعتکاف میں حاجتوں کو خدا نے منع نہیں کیا۔ان کے قضا کرنے کے لیے مساجد سے باہر نکلنے کی اجازت بھی دے دی۔ پھر بھی اگر کسی سے نہ ہو سکے تو اس کا قصور ہے۔مباشرت میں چونکہ حاجت خفیف ہے، اس لیے لَا تُبَاشِرُوْھُنَّ سے مباشرت کی ممانعت کردی، اور کھانے پینے کی حاجت شدید ہے۔اس کے کرنے کی بھی اجازت دی اور حاجت کی رعایت یہاں تک کی گئی ہے کہ اگر کوئی مثلاً بساطی ہے اور بساط اس کی اتنی ہی ہے کہ

اسی پر گزر رہے تو اسے جائز ہے کہ وہ تجارت بھی مسجد میں کرلے مگر اسباب مسجد میں نہ لاوے۔ کیا ٹھکانا ہے وسعت کا، خدا کے معاملات کو دیکھو کس قدر سہل ہیں۔ پھر بھی اگر ان سے کوئی تجاوز کرے تو پھر ایسے اعتکاف سے فائدہ کیا۔

ایک حکمت اعتکاف میں یہ ہے کہ اس میں شب قدر کی تلاش (ثواب ڈھونڈنا) بھی ہے۔ حدیث میں آتا ہے: شب قدر کو طاق راتوں میں تلاش کرو۔

اور اس حکمت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ معتکف کو اپنا ضروری سامان مسجد میں رکھنا جائز ہے مگر زیادہ بکھیڑا لانا مناسب نہیں کیونکہ اس سے تو وہ بھی گھر بن جائے گا۔ پھر جس طرح گھر میں عبادت و بیداری میں دشواری تھی وہی بات مسجد میں ہوگئی۔ سب کا حاصل یہ ہوا کہ مسجد میں تو گھر کے فتنہ سے چھڑا کے لائے تھے، وہاں تم نے اتنا بکھیڑا اکٹھا کیا کہ وہ بھی گھر کی طرح ہوگئی۔ مسجد میں معتکف کو اتنا بکھیڑا نہ لے جانا چاہیے۔ بعضے آدمی ہوتے بھی ہیں بکھیڑئیے۔ گو گناہ تو نہیں مگر خلافِ ادب ہے۔ مسجد میں آئے ہو گھر چھوڑ کے، اگر تم نے اسے بھی گھر بنالیا تو مسجد میں آنے کا کیا فائدہ؟ غرض نہایت مختصر سامان کے ساتھ مسجد میں آنا چاہیے بلکہ اپنے گھر میں بھی نہایت مختصر سامان سے رہنا چاہیے تو مسجد تو پھر خانہ خدا ہے۔ اس میں زیادہ بکھیڑا لانا مناسب نہیں۔

یہ پانچ راتیں ہیں جن میں احتمال ہے شب قدر کا، سبحان اللہ، عَاكِفُوْنَ فِي الْمَسَاجِدِ نے اس کی تلاش کے لیے مسجد میں پہنچا دیا۔ بھلا گھر میں اس کی کہاں فرصت؟ مسجد میں معتکف کو اس لیے لایا گیا کہ شب قدر کی تلاش سہل ہو۔ کیونکہ بہت سے آدمی ہوں گے، جب سب ایک ہی کام میں مشغول ہوں گے تو دل بھی لگے گا۔

اور اس میں بھی عجیب حکمت ہے کہ شب قدر کی تاریخ معین نہیں کی، کیونکہ مقصود پانچ راتوں میں جگانا تھا۔ پھر، سبحان اللہ، اس میں یہ کیسا اعتدال ہے کہ متواتر پانچ راتوں میں نہیں جگایا، ایک رات جگایا اور ایک رات سلایا۔ اور پھر اس سونے میں بھی ثواب جگانے کا دیا۔ یہ بات

میں اپنی طرف سے گھڑ کے نہیں کہتا۔ حدیث سے ثابت ہے۔ سونا جب ذریعہ ہے جاگنے کا، اور وہ ذریعہ ہے عبادت کا، اور ہوا بھی ہے اسی عبادت کے قصد سے، تو اس میں کیوں ثواب نہ ملے گا۔

شب قدر نہایت قابلِ قدر چیز ہے۔ اس میں جاگنا چاہیے اور خدا کی عبادت کرنا چاہیے اور کوئی ساری رات جاگنا ضروری نہیں، جتنا جس سے ہو سکے، جاگے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ عادت سے کسی قدر زیادہ جاگے۔ اس عبادت سے شب قدر کی روح مشاہدہ ہے۔ اس میں حق جل وعلیٰ شانہ کی تجلی ہوتی ہے اور گو ہمیں ان تجلیات کا دکھائی دینا ضروری نہیں مگر اس کی پہچان اس سے ہوتی ہے کہ اس میں اور، اور راتوں میں یہ فرق ہے کہ اس رات میں بہ نسبت اور راتوں کے عبادت میں زیادہ جی لگتا ہے، قلب کو غفلت نہیں ہوتی اور کیوں ہو، وصل کے ساتھ ہجر جمع نہیں ہوتا ؎

شب قدر است طے شد نامہ ہجر	سلام فیہ حتی مطلع الفجر

شب قدر میں نامہ ہجر لپیٹ دیا گیا ہے اس میں سراپا سلامتی و برکت ہے طلوعِ فجر تک۔

اس رات کی یہ فضیلت ہے کہ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا میں مَلٰٓئِكَةُ رحمت کا نزول ہوتا ہے اور اس میں دو احتمال ہیں۔ یا تو اس میں فضیلت اس وجہ سے آئی ہے کہ اس میں ملائکہ نازل ہوتے ہیں یا ملائکہ اس وجہ سے نازل ہوتے ہیں کہ اس میں پہلے سے فضیلت ہے، بہر حال جو بھی ہو ؎

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف
ور بکشد زہے طرب ور بکشم زہے شرف

اس کا دامن ہاتھ آ جائے وہ کھینچ لے تب بھی مقصود حاصل، ہم کھینچ لیں تب بھی، اسی طرح اس میں بھی بہر حال فضیلت ہے۔ اسی واسطے حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو اس رات سے محروم رہ گیا وہ بڑی دولت سے محروم رہ گیا۔ یہ دن سال بھر کے بعد آتے ہیں، ان کی قدر کرنا چاہیے کیونکہ زندگی کا کیا بھروسہ۔ یوں تو ہر رات میں من وجہ فضیلت ہے، یہ اس لیے

کہتا ہوں کہ اگر کسی سے فوت ہو جائے تو اور ہی کسی رات میں کچھ کر لے۔ گو وہ ویسی تو نہ ہوگی مگر کام بن جائے گا۔

ای خواجہ چہ پرسی زشب قدر نشانی
ہر شب شب قدر ست اگر قدر بدانی

شب قدر کی نشانی کو تم کیا دریافت کرتے ہو، اگر قدر کرو تو ہر رات شب قدر ہے۔

لیکن اس میں پھر بھی خصوصیت ہی ہے۔

اُوپر جو ذکر کیا گیا کہ اس میں تجلی حق ہوتی ہے۔ اس میں بھی دو احتمال ہیں یا تو اس شب کی فضیلت کے سبب اس میں تجلی ہوتی ہو اور یا خود تجلی کے سبب اس کی فضیلت ہوتی ہو۔ حافظ شیرازی کے قول سے احتمال ثانی اقرب معلوم ہوتا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں ؎

آن شب قدرے کہ گویند اھل خلوت امشب است
یارب ایں تاثیر دولت از کدامیں کوکب است

وہ شب قدر کہ اہل خلوت کہتے ہیں آج کی رات ہے، یارب! اس میں یہ فضیلت کس کوکب کی وجہ سے آئی۔

یعنی یہ فضیلت شب قدر میں کس کوکب کی وجہ سے آئی۔ کوکب سے مراد تجلی حضرت حق جل وعلیٰ شانہ ہے مع ظہور۔ بہرحال یہ وقت عزیز ہے، بڑے فیوض وانوار وبرکات کا ہے۔ اس میں جہاں تک ہو سکے، اعتکاف کرو، اگر نہ ہو سکے تو ان پانچ راتوں میں جاگ ہی لو۔ اگر تمام راتوں میں نہ ہو سکے تو بعض میں جاگ لو۔ بعض کے بھی بعض حصّہ میں جاگ لو، تب بھی کافی ہے۔[۱]

❖❖❖

۱۔ ترتیب وتدوین: م-س

اعتکاف کے مسائل

عروج احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ

اعتکاف میں مسجد کے وضوخانہ اور غسل خانہ میں جا کر وضو اور غسل کرنے کے مسئلہ پر عموماً سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ اس مسئلہ پر درج ذیل تحریر سید احمد عروج قادری رحمۃ اللہ علیہ کے جوابات سے مرتب کی گئی ہے اور اس مسئلہ کے بارے میں ان کی رائے سامنے لاتی ہے۔

۱- اعتکاف کی کتنی قسمیں ہیں؟

فقہائے احناف نے اعتکاف کی تین قسمیں بیان کی ہیں:

۱- واجب، وہ اعتکاف ہے جس کی نذر مانی گئی ہو۔ جائز نذر کا پورا کرنا واجب ہے۔ واجب اعتکاف کم سے کم ایک دن کا ہوتا ہے جس میں رات بھی شامل ہوتی ہے۔ اس اعتکاف میں روزہ رکھنا بھی ضروری ہے۔ عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کے تین دن چھوڑ کر سال کے کسی بھی دن، بشمول رمضان، اعتکاف کی نذر مانی جا سکتی ہے۔

۲- سنت موکدہ اعتکاف، رمضان المبارک کے اخیر عشرہ کا اعتکاف ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی وفات تک ہمیشہ آخر عشرہ کا اعتکاف کرتے رہے۔

۳- نفل اعتکاف کے لیے نہ روزہ کی شرط ہے، نہ کسی خاص دن کی، نہ مقررہ وقت کی۔ یہ ایک دن سے زیادہ بھی ہوسکتا ہے، کم بھی۔ پندرہ منٹ بلکہ اس سے بھی کم وقت کے لیے ہوسکتا ہے۔ یہاں تک کہ مسجد میں داخل ہوتے وقت اعتکاف کی نیت کی جا سکتی ہے۔

لوگ یہ نیت کرتے بھی ہیں اور نیت کرنے والا جتنی دیر مسجد میں رہے، انشاء اللہ اس کو اعتکاف کا اجر ملے گا۔ رمضان کے مہینہ میں بھی دس دن سے کم کے لیے اعتکاف کیا جاسکتا ہے مگر وہ نفل اعتکاف ہوگا۔

۲- کیا بلا عذر مسجد سے باہر نکلنے سے اعتکاف فاسد ہو جاتا ہے؟

جہاں تک فقہ حنفی کا تعلق ہے بلا عذر مسجد سے باہر نکلنے سے جو اعتکاف فاسد ہو جاتا ہے وہ واجب اعتکاف ہے۔

علامہ ابن نجیم نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے: فساد کا تصور نہیں ہوتا مگر واجب (اعتکاف) میں۔[۱]

واجب اعتکاف میں بھی پاخانہ، پیشاب اور نمازِ جمعہ کے لیے نکلنے کی اجازت ہے، چنانچہ علامہ کاسانی لکھتے ہیں:

معتکف اعتکاف واجب میں اپنے اعتکاف کی جگہ سے نہ رات کو نکلے گا اور نہ دن کو، مگر وہ پاخانہ، پیشاب اور جمعہ ادا کرنے کے لیے نکل سکتا ہے۔[۲]

بلا عذر کتنی دیر کے لیے مسجد سے باہر نکلنے سے واجب اعتکاف فاسد ہوتا ہے؟ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اعتکاف فاسد ہو جائے گا خواہ معتکف تھوڑی دیر کے لیے نکلا ہو، مگر امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اگر معتکف بلا عذر آدھے دن سے زائد مسجد سے باہر رہے گا، تب اس کا واجب اعتکاف فاسد ہوگا، ورنہ نہیں۔[۳]

۳- کیا وضو اور غسل واجب کے لیے مسجد سے باہر جانے کی اجازت ہے؟

جس طرح رفع حاجت انسان کی ایک ضرورت ہے، اسی طرح طہارت حاصل کرنا بھی اس کی ایک ضرورت ہے، خواہ حدث اصغر سے ہو یا حدث اکبر سے۔ لہٰذا معتکف کو جس طرح پہلی

۱۔ البحر الرائق

۲۔ البدائع والصنائع

۳۔ بدائع

ضرورت کے لیے مسجد سے باہر جانے کی اجازت ہوگی، اسی طرح دوسری ضرورت یعنی طہارت حاصل کرنے کے لیے بھی اس کو مسجد سے باہر جانے کی اجازت ہوگی۔ ھدایہ میں لکھا ہے کہ:

معتکف، مسجد سے باہر، طہارت سے فراغت کے بعد نہ رُکے۔

اس عبارت میں ''طہور'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جس میں وضو اور غسل واجب دونوں شامل ہیں۔ فتاویٰ عالمگیری میں بھی گھر میں وضو سے فراغت تک ٹھہرنے کی اجازت ہے۔ وضو کے بعد اگر وہ بلا عذر اپنے گھر ٹھہر جائے، تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کا اعتکاف واجب فاسد ہو جائے گا۔

یہ رائے صحیح نہیں ہے کہ معتکف کو مسجد کے اندر بیٹھ کر ہی وضو یا غسل واجب کرنا چاہیے۔ مسئلہ صرف اتنا ہے کہ معتکف اگر مسجد کے اندر وضو یا غسل کر سکتا ہو تو خاص طور پر اس کو اجازت ہے (نہ کہ لازم)۔ شرط یہ ہے کہ پانی مسجد میں نہ گرے اور وہ آلودہ نہ ہو۔ چنانچہ فتاویٰ عالمگیری میں لکھا ہے:

اگر معتکف کے لیے مسجد میں غسل کرنا ممکن ہو، اس کے بغیر کہ مسجد آلودہ ہو، تو کوئی حرج نہیں۔ ورنہ وہ مسجد سے نکلے گا، غسل کرے گا اور پھر مسجد میں واپس آئے گا۔

فقہ حنفی میں جو تصریحات ہیں ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسجد میں جو جگہ وضو کے لیے بنائی جاتی ہے، اس کا حکم بھی گویا مسجد کے ایک گوشہ کا ہی ہوتا ہے۔ مثلاً اذان گاہ ایسی ہو جس کا دروازہ مسجد سے باہر ہو تو معتکف اس اذانگاہ پر جا کر اذان دے سکتا ہے۔ علامہ کاسانی نے لکھا ہے کہ

اذان گاہ بھی مسجد کے گوشوں میں سے ایک گوشہ ہے۔ کیونکہ وہاں ہر وہ شے ممنوع ہے جو مسجد میں ممنوع ہے، اور اس کو فروخت کرنا بھی جائز نہیں۔ یہی بات وضو گاہ پر بھی صادق آتی ہے۔

۴- کیا رمضان کے اخیر عشرہ کے اعتکاف مسنون میں معتکف آٹھ دس منٹ کے لیے صفائی بدن یا نشاط طبیعت کے لیے اسی مسجد کے غسل خانہ میں غسل غیر واجب کرنے جا سکتا ہے؟

اس سلسلہ میں درج ذیل باتوں پر غور کرنا چاہیے:

۱- رمضان کے اخیر عشرہ کا اعتکاف، اعتکاف واجب نہیں ہے۔

۲- امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک آدھے دن سے کم وقت کے لیے بلا عذر مسجد سے باہر نکلنے سے واجب اعتکاف بھی فاسد نہیں ہوتا۔

۳- امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اعتکاف واجب کے سلسلہ میں اپنی رائے میں ''ساعۃ'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس سے مراد یقینا ۲۴ گھنٹوں میں سے ایک گھنٹہ تو نہیں، لیکن اب گھڑیوں کے منٹوں میں کوئی نہ کوئی مقدار تو متعین کرنی چاہیے۔ اب اگر بالفرض دس منٹ مقرر کیے جائیں اور کوئی آٹھ منٹ میں غسل غیر واجب کر کے مسجد میں واپس آ جائے تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کے مطابق بھی اس کا اعتکاف واجب فاسد نہیں ہوتا۔

فقہی تفصیلات پڑھ کر اس حقیر کی رائے یہ بنی ہے کہ رمضان کے اعتکاف مسنون میں بھی بہتر یہی ہے کہ معتکف محض صفائی بدن کے غسل کے لیے مسجد سے باہر نہ نکلے۔ لیکن وہ تھوڑی دیر میں غسل کر کے مسجد میں واپس آ جائے تو اس کا اعتکاف فاسد نہ ہوگا۔

۵- کیا اعتکاف میں چند منٹ کے لیے اپنی تجارت کا حساب دیکھا جا سکتا ہے؟

جب مسجد میں معتکف کے لیے خرید و فروخت اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ سامانِ تجارت مسجد میں نہ لایا جائے تو اپنی تجارت کا حساب دیکھنا بھی جائز ہوگا۔ لیکن بہتر یہی ہے کہ اعتکاف دنیوی کاروبار کی مشغولیت سے خالی ہو۔ اس لیے ایسا اس وقت کرنا چاہیے جب حساب دیکھنے والا کوئی معتمد علیہ شخص نہ ہو اور حساب نہ دیکھنے سے آیندہ کسی دشواری یا نقصان کا اندیشہ ہو۔[1]

❖❖❖

---

[1] مرتبہ: خرم مراد

عید الفطر: رحمتوں، شفاعتوں، نذرانوں اور شکرانوں کا جشن

محمود فاروقی رحمۃ اللہ علیہ

اسلام کا سماجی نظام اپنی اصل کے اعتبار سے ایک بہت بڑا اخلاقی نظام ہے۔ اس کی عبادات اور معمولات کا سارا دارومدار اعلیٰ اخلاقیات پر ہے۔ فکروخیال کی پاکیزگی، اعمال میں راست روی، معاملات میں دیانت داری، معاشرت میں خوش اطواری اور روابط وتعلقات میں میانہ روی اس کی بنیادی خصوصیات ہیں۔

جنت کا معاشرہ

اسلام، انسانی زندگی کے لیے محض دُنیاوی اسکیم کی حیثیت نہیں رکھتا، بلکہ وہ اپنی روح اور اپنے احکام کے اعتبار سے ایک وسیع ترین ''دو جہانی اسکیم'' ہے۔ اسلامی فکر کے لحاظ سے دوسری دُنیا کوئی تخیلی اور مثالی دُنیا نہیں بلکہ ایک حقیقی جیتی جاگتی دُنیا ہے، ایک ٹھوس اور واقعی دُنیا جو انسانی تہذیب وتمدن کے ایک نہایت ہی اعلیٰ ترین معیار کو پیش کرے گی۔ اس مکمل ترین دُنیا میں بسنے والے انسانوں کو، جن کا مسکن فردوس بریں ہوگا، اتنا کامل الاختیار بنا دیا جائے گا کہ وہ، قوانین طبعی کے تحت نہیں بلکہ قوانین طبعی، ان کے زیر اختیار ہوں گے۔

جنت کا یہ مہذب ترین معاشرہ دراصل انسانی ترقی کی وہ معراج ہوگی جس کا حقیقی تصور کرنا بھی یہاں محال ہے۔ ظاہر ہے جنت کے اس اعلیٰ ترین معاشرہ میں اتنے وسیع اور ناقابلِ قیاس اختیارات تیسرے درجے کے گھٹیا اخلاق اور ناقص معیار والے انسانوں کے

ہاتھ میں نہیں دیے جاسکتے جو نفس پرست، خود غرض، ظلم پیشہ، بدخلق، گندہ دہن، گندہ دل، گندہ ذہن، گندہ رو، گندہ پیرہن ہوں۔ جو سوچیں تو بُرا سوچیں، بولیں تو بُرا بولیں اور چلیں تو بُری راہ چلیں، کریں تو بُرے کام کریں۔ منطقہ جنت میں ایسے ہی انسان بسائے جائیں گے جو حسنِ ذوق، حسنِ خیال، حسنِ فکر، حسنِ گفتار اور حسنِ کردار غرض ہر اعتبار سے ''انسان کامل'' ہوں۔

تربیت کا انتظام

اس اعلیٰ ترین شستہ اور پاکیزہ ''اخروی معاشرہ'' کے لیے اسلام ایک تربیتی نظام کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ان تمام انسانوں کو جو اللہ، اللہ کے رسول ﷺ اور آخرت کی اس حقیقی زندگی پر یقین اور ایمان رکھتے ہیں منطقہ جنت کا شہری بنانے کی ہمہ پہلو تربیت دیتا ہے۔ اس دُنیا میں وہ ایک ایسا معاشرتی، سیاسی، معاشی اور تہذیبی ماحول بناتا ہے جس میں انسانی صلاحیتوں اور کمالات کے نشو و نما پانے کے مواقع پیدا ہوجاتے ہیں اور انسانی مواد مفید اور پاکیزہ مقاصد کے لیے ازخود منظم و مربوط ہوتا چلا جاتا ہے۔

روزہ، ایک کورس

اسلامی عبادات، اسلام کے اس تربیتی نظام کا ضروری اور لازمی حصّہ ہیں اور وہ اس کے مقاصد و نتائج کو حاصل کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ رمضان کے روزے بھی اس نظامِ تربیت کا اہم ترین کورس ہیں۔ روزہ کے ذریعہ تسخیر خوری، ضبطِ نفس، اعتدال مزاج، تنظیم عادات اور دوسرے تمام تر اخلاقی محرکات کو اُبھارا جاتا ہے تا کہ ناقص اور خام انسانی مواد روزہ کی بھٹی میں تپ کر ہر طرح کے کھوٹ اور آلائشوں سے پاک ہوجائے، انسان کی شخصیت نکھر اور سنور جائے، اس کا کردار اس درجہ پختہ اور مضبوط ہوجائے کہ وہ جہان آخرت میں اللہ کے نائب اور نمایندہ کی حیثیت سے نظامِ کائنات کے وسیع تر اختیارات کو سنبھالنے اور منشا خداوندی کے مطابق ان کو استعمال کرنے کا اہل سمجھا جائے۔

اختتامی تقریب

جب تیس دن کا یہ تربیتی کورس مکمل ہو جاتا ہے تو اس کی اختتامی تقریب منعقد کی جاتی ہے جس میں اسلامی معاشرہ کے افراد اپنی تربیت کی تکمیل اور اخروی معاشرہ کے رہن سہن کی صلاحیت اور سلیقہ پیدا کر لینے پر خوشی مناتے، بطور شکرانہ کے اللہ کے حضور فطرہ کی نذر پیش کرتے اور اس کی تعظیم و تکبیر کے لیے دوگانہ عید ادا کرتے ہیں۔ اسی مسرت انگیز تقریب کا نام عیدالفطر ہے۔

فطر کی اہمیت

مختلف قوموں کے بیشتر تہوار، شخصیتوں یا قومی کارناموں سے نسبت رکھتے ہیں۔ ہماری یہ عید تہواروں سے قطعی مختلف ہے۔ یہ نہ کسی شخصیت سے منسوب ہے اور نہ کسی قومی واقعہ یا کارنامہ سے، بلکہ یہ ایک ایسی منفرد عید ہے جس کی کوئی مثال اقوام و مذہب کے تہواروں میں نہیں ملے گی۔ یہ عید ایک نیکی سے منسوب ہے، ایک ایسی نیکی جو خلق خدا کی بھلائی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ عیدالفطر کا نام ہی بتا رہا ہے کہ یہ فطرہ والی عید ہے۔ یہ فطرہ خیرات نہیں ہے کہ آدمی کا جی چاہے تو ادا کر دے اور نہ چاہے تو ادا نہ کرے، بلکہ اسلامی مملکت میں یہ مسلمان شہریوں کا ایک ایسا قانونی فرض ہے جسے ادا نہ کرنے پر وہ سزا کے مستحق ٹھہرتے ہیں......فطرہ اپنے اس قانونی تحفظ کے ساتھ ایک لازمی رفاہی اسکیم کی حیثیت رکھتا ہے جس میں حصّہ لینا فطرہ ادا کرنے کی اہلیت و استطاعت رکھنے والے ہر بالغ و نابالغ مسلمان مرد اور عورت پر واجب ہے۔

رمضان ہمارا مہمان

برکتوں والا مہینہ رمضان ایک معزز آسمانی مہمان تھا جو تیس دن تیس راتوں تک مسلم معاشرے میں مقیم رہا۔

وہ ہمارا مہمان تھا۔ ہمارے گھروں میں، سحر و افطار، تراویح و تہجد میں، اور پھر دن بھر روزہ

کے مبارک لمحوں میں ہمارے ساتھ ساتھ رہا۔

وہ آیا تھا تو خالی ہاتھ نہیں آیا تھا۔ اپنے شب و روز کے خریطوں میں رحمتوں، برکتوں، نعمتوں اور شفاعتوں کے تحفے بھر بھر کر لایا تھا، یہ تحفے اللہ رب العزت کی بارگاہ خاص سے عنایت کیے گئے تھے کہ میری دُنیا میں جاؤ اور میرے وفا شعار دوستوں کو ڈھونڈو، جو وہاں مجھے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں اور ان کے دامن ہمارے ان پاکیزہ تحفوں سے بھر دو۔

ہمارا یہ معزز مہمان، ماہِ صیام رحمتوں اور برکتوں کی سوغاتوں سے لدا پھندا اللہ کے دوستوں کی تلاش میں یہاں آیا تھا۔ جہاں کسی کو سنا کہ اللہ کو پکارتا ہے، اس نے اس کے دامن طلب کو ہدیہ دوست سے بھر دیا۔ رحمتوں، برکتوں، نعمتوں اور شفاعتوں سے مالا مال کر دیا۔

اب جبکہ وہ ہمارے درمیان سے رخصت ہو گیا تو جاتے ہوئے بھی وہ خالی ہاتھ نہ گیا۔ آتے ہوئے وہ اللہ کے بھیجے ہوئے ہدیوں، تحفوں، رحمتوں اور برکتوں کو اُٹھا کر لایا تھا، اور اب جاتے وقت وہ اس کے بندوں کی عبادتوں، نیکیوں، بھلائیوں کو اکٹھا کر کے لے گیا ہے۔

وہ یہ نذرانے اللہ کے سامنے پیش کرے گا، وہ اس کے حضور ایک ایک روزہ کی سفارش و شفاعت کرتے ہوئے کہے گا:

''اے رب! میں نے اس کو کھانے پینے اور شہوت سے دن بھر روکے رکھا تھا، اس کے حق میں میری شفاعت قبول فرما''۔

اس کی تائید کرتے ہوئے قرآن بارگاہ رب العزت میں عرض کرے گا:

''اے رب! میں نے اسے رات کے آرام سے روکے رکھا تو میری شفاعت اس کے حق میں قبول فرما''۔

اللہ ان دونوں کی شفاعت کو قبول کر کے اس روزہ دار مومن کی مغفرت فرما دے گا اور اس کو دُنیا و آخرت میں بہتر اجر سے نوازے گا۔[۱]

۱۔ بروایت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ

مہمان کے ساتھ سلوک

آج عیدالفطر کے دن، اللہ کے دربار میں، ماہِ رمضان دُنیا میں پورے تیس دن تک اپنے قیام کی رپورٹ پیش کر رہا ہے اور نام بنام بتاتا جا رہا ہے کہ اس کے ساتھ کس نے کیا سلوک کیا۔ کون اس کی آمد پر خوش ہوا، اور کس نے اسے دیکھ کر تیوریاں چڑھالیں، کس نے اس کی آؤ بھگت کی اور روزہ داری اور نیکوکاری سے اس کی خاطر تواضع کی، اور کس نے اس کو اپنے گھر میں گھسنے نہیں دیا اور دُور ہی سے اسے پھٹکار دیا۔

اس دن ان دونوں طرح کے لوگوں کے لیے ایک بہتر موقع ہے۔ ان کے لیے جو اپنی کوتاہیوں اور غفلتوں سے اللہ کے فرستادہ اس معزز مہمان کی قدر نہ کر سکے، اور ان لوگوں کے لیے بھی جنھوں نے دل و جان سے اس کی خدمت کی، کہ وہ اس وقت خاص میں بارگاہِ رب العزت میں سچے دل سے نذرانہ پیش کریں، اس کے حضور صف بستہ ہو جائیں اور اظہارِ اطاعت کے لیے سربسجود ہو جائیں۔

یہ نذرانہ اور اظہارِ اطاعت، کوتاہ عمل بندوں کے لیے دربارِ الٰہی سے بخشش و مغفرت کا وسیلہ بن جائے گا اور نیکوکار بندوں کے لیے رحمت و برکت کا ذریعہ۔

اس عالی مرتبت دربار کے لیے قیمتی سے قیمتی چیز بھی لائق پیش کش نہیں ہو سکتی، اس کے دربار کا انمول تحفہ تو صرف ایک ہی ہے کہ اس کے مستحق بندوں کی حتی المقدور مدد کی جائے، خلق کی خدمت ہی وہ سوغات ہے جو وہاں مرغوب و پسند ہے۔

فطرہ اور دوگانہ عید

اس موقع خاص کے لیے بہترین نذرانہ، فطرہ ہے۔ اور بارگاہِ الٰہی کے حضور اظہار اطاعت، صلوٰۃ ہے۔

عیدالفطر کی تقریب دو اہم باتوں پر مشتمل ہے، ایک فطرہ دوسری دوگانہ نماز۔ فطرہ حقوق العباد سے متعلق ہے، اور نماز عید حقوق اللہ سے تعلق رکھتی ہے۔ مگر اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے

ان دونوں چیزوں، نمازوں اور فطرہ میں سے فطرے کو نماز پر ترجیح دی ہے۔ اول یہ کہ اس عید کا نام ہی فطرہ کی نسبت سے عیدالفطر رکھا۔ دوسرے یہ کہ فطرہ کی ادایگی کو نماز کی ادایگی سے اول رکھا، اور وہ بھی سخت تاکید کے ساتھ کہ نماز سے پہلے فطرہ ادا کرو۔ یہ اصرار اور تاکید ی ایسی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ جو نماز سے پہلے بغیر کسی عذر کے فطرہ ادا نہ کرے، اللہ کے حضور اس کی آمد پسندیدہ نہیں۔

جشن عید کا آغاز فطرہ سے ہوتا ہے۔ یہ بارگاہ الٰہی میں بندوں کی طرف سے ایک نذرانہ ہے جو بذاتِ خود ایک التجا اور عرض داشت کی حیثیت رکھتا ہے کہ:

''اے اللہ، اگر ہمارے روزوں میں کوئی کمی رہ گئی ہو، یا ہم نے ماہِ صیام کی عبادتوں میں کوئی قصور و کوتاہی کی ہو، تو اس فطرہ کو اس کی تلافی کے لیے قبول فرمالے، اور ہماری نمازوں کو، ہمارے روزوں کو، ہماری نیکیوں اور بھلائیوں اور تلاوتِ قرآن کو قبول فرمالے، اور ہمارے حق میں ماہِ صیام اور مقدس قرآن کی سفارش و شفاعت کو منظور کرلے''۔

اس فطرہ کو ادا کرنے کے بعد رمضان کی ذمہ داریوں کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ تکمیلِ فرض کی خوشی میں سجدۂ شکر بجالانا چاہیے کہ ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ عید کی دوگانہ نماز دراصل اسی شکرانہ کی نماز ہے۔ اس نماز میں عام نمازوں سے زیادہ تکبیریں کہنے کی یہی عارفانہ توجیہہ ہے کہ اس کے خادم، تکمیل خدمت کی خوشی میں بے خود ہو جاتے، اور والہانہ طور پر اپنے آقا کا نام لے کر پکارتے ہیں، اس کی عظمت و کبریائی کا اعلان کرتے ہیں، اور اس کی حمد و تقدس بیان کرتے ہیں۔

رفاہِ عامہ

عیدالفطر ایک تہوار نہیں بلکہ رفاہِ عامہ کی ایک تدبیر بھی ہے جو فطرہ دینے کا اہل ہو اور فطرہ نہ دے، تو اس کی عید ادھوری رہ جاتی ہے، کیونکہ وہ ماہِ صیام کی تربیت کو جھٹلاتا ہے، جو غریبوں، مستحقوں کو سہارا دینے اور پسماندہ خاندانوں کی معاشرے کی سطح تک پہنچانے کے لیے ایثار و قربانی کے جذبات پیدا کرتی اور بھوک پیاس کی تکلیف کا احساس دلاتی ہے۔ فطرہ میں جو

اجناس یا نقد روپیہ اسلامی معاشرہ کا ہر فرد ادا کرتا ہے وہ مجموعی طور پر ملک وملت کے پسماندہ اور مستحق افراد کی وسیع پیمانے پر مدد کا ذریعہ بن جاتا ہے۔اس طرح عیدالفطر اور دوسرے تمام اسلامی تہوار ہر سال قومی دولت کو معاشرہ کے ہر طبقہ میں گردش میں رکھتے ہیں۔

عبادت

عیدالفطر ایک جشن مسرت ہی نہیں، ایک عبادت بھی ہے۔ یہ ایک بہت بڑی عبادت یعنی روزہ کا اختتام ہے۔فطرہ ادا کرنے کے بعد یومِ فطر کی سب سے پہلی مشغولیت عید کی نماز ہے جو اللہ کے حضور بطور شکرانہ ادا کی جاتی ہے۔اسلامی معاشرہ کے تمام افراد کا عیدگاہ میں جمع ہونا،مل کر اللہ کی تکبیر بلند کرنا،اس کی حمد وثنا بیان کرنا،اس کے حضور رکوع وسجود کرنا،اس کی بارگاہِ کرم سے مغفرت طلب کرنا،بھلائیوں اور رحمتوں کی دُعائیں مانگنا شکر وعبادت کی ایک ایسی مقدس فضا پیدا کر دیتا ہے کہ دل ایک دوسرے کی طرف جھکنے اور سب کے لیے ایک ہونے اور نیک بننے کی ترغیب پیدا ہو جاتی ہے۔

ہم ایک ہیں

نمازِ عید کی یہ اجتماعی تقریب جس میں چھوٹے بڑے ہر رنگ، ہر نسل، ہر قبیلہ، ہر برادری، ہر طبقہ سے تعلق رکھنے والے مسلمان اکٹھے ہو جاتے ہیں،مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والوں، مختلف زبان بولنے والوں کی یہ یکجائی ان کے باہمی اتفاق واتحاد کے رجحان کو تقویت دیتی ہے، اور یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ ہم علیحدہ نہیں، ہم ایک ہیں، ہم غیر نہیں ہیں، ہم بھائی ہیں، ہمارا خدا ایک ہے، ہمارا رسول ﷺ ایک ہے، ہمارا قبلہ ایک ہے، ہمارا قرآن ایک ہے، ہمارا مسلک اور دین ایک ہے اور ہم ایک بہت بڑی عالمی برادری ہیں جو خدا کی وفاداری اور اطاعت رسول ﷺ کی پیروی ومتابعت کے پاکیزہ اصولوں پر وجود میں آئی ہے، ہم کو ایک دوسرے سے نفرت نہیں کرنا چاہیے بلکہ ایک دوسرے سے محبت ومعاونت کرنا چاہیے،عید سعید کا یہی مقصود اور یہی پیغام ہے۔

عید الفطر کے دن معمولاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

جب ماہِ صیام کے دن پورے ہو جاتے، عید کا چاند دیکھ لیا جاتا، اور ایک شب گزر جاتی، تو صبح اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حسب معمول مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نمازِ فجر کی امامت فرماتے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے کاشانہ مبارک میں تشریف لے جاتے۔ جب کچھ دن چڑھ جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غسل فرماتے، اور اپنے کپڑوں میں صاف ستھرا اُجلا لباس زیب تن فرماتے، آنکھوں میں سرمہ پھیرتے، کپڑوں میں خوشبو ملتے، سر کے بالوں میں تیل ڈالتے اور کنگھے سے سنوارتے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چند کھجور، دودھ اور جو کچھ بھی اس وقت میسر ہوتا تو نوش فرماتے۔ اس کے بعد اپنے اصحاب کے ساتھ عید گاہ میں تشریف لے جاتے اور وہاں جو پہلا کام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کرتے وہ نماز تھی۔ جب لوگ صفوں کو درست کر لیتے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عید کی دو رکعات زائد تکبیروں کے ساتھ پڑھتے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا سہارا لے کر کھڑے ہو جاتے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجمع سے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خطبہ سننے کے لیے بے چینی سے منتظر ہوتا، خطاب فرماتے، لوگوں کو نصیحت فرماتے، ان کو ہدایات واحکام دیتے۔

❖❖❖

تقلیل غذا، وسیلہ صحت

حکیم محمد سعید رحمۃ اللہ علیہ

کھانے پینے میں اگر انسان احتیاط اور اعتدال سے کام لے تو صحت برقرار رہتی ہے۔ اس حکمت کو قرآن کریم میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے:

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا [اعراف۷:۳۱]

یعنی ''کھاؤ پیو مگر اسراف نہ کرو''۔

اس آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے بندوں کو اسراف سے منع کر کے محض بدل یا ما یتحلل کے طور پر کھانے پینے کا حکم دیا ہے تاکہ کام اور محنت کے دوران ضائع ہونے والی توانائی بحال ہوتی رہے اور جسم کی ہیئت اور اس کی طبعی کیفیت برقرار رہ سکے۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسانی فطرت اس امر کی مقتضی ہے کہ غذا مقدار و کیفیت میں ضرورت کے عین مطابق ہو۔ ان دونوں اعتبارات سے غذا میں کسی طرح کا اضافہ اسراف ہو جائے گا جو نہ صرف فطرت کے خلاف ہوگا بلکہ جسم کی مصیبتوں، آلام اور امراض میں مبتلا کرے گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

دو نعمتیں ایسی ہیں کہ جن کے بارے میں لوگ عام طور پر گھاٹے میں رہتے ہیں، ایک صحت اور دوسرے فراغت۔

مسند میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے:

آدمی کو اپنی بھوک سے زیادہ نہ کھانا چاہیے کیوں کہ ابن آدم کو صرف چند لقمے کافی ہوتے ہیں کہ اس کی کمر سیدھی رہے اور وہ بھی اس حساب سے کہ معدے کی گنجائش کا ایک تہائی حصّہ کھانے کے لیے، دوسرا پانی کے لیے اور تیسرا سانس لینے کے لیے ہو۔

میں سمجھتا ہوں کہ اگر آدمی باعتبار کم و کیف، بقدر کفایت غذا پر قناعت کرنے کا خود کو عادی بنائے تو اس کی آدھی سے زیادہ مشکلات اور آدھے سے زیادہ مسائل از کود نابود ہو جائیں گے۔ زندگی کی بھاگ دوڑ جس نے آج کے ہر انسان کو ہلکان کر رکھا ہے اور انسانیت سے اس کا چین اور قرار چھین کر ساری دُنیا کو میدانِ کارزار بنا رکھا ہے، یہ سب آج کے انسان کی جوع البقر کا نتیجہ ہے۔ یعنی خرابی کی اصل اور جڑ اسراف ہے۔ یہ اسراف جب مزاج اور طبیعت کا جزو بن جائے تو ساری زندگی اس سے متاثر ہوتی ہے۔

اگر انسان زیادہ سونے، زیادہ کھانے، زیادہ کمانے اور مستقبل کی زیادہ فکر جیسی مضر عادتوں سے اجتناب کرے تو بیمار ہونے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں، کیوں کہ یہی اسباب انسان کی قوتِ حیات کو کمزور کرتے ہیں جس سے امراض آدبوچتے ہیں۔

تمام احکاماتِ الٰہی، ارشاداتِ نبوی ﷺ اور فرموداتِ حکما و علما نیز ''خوردن برائے زیستن نہ کہ زیستن برائے خوردن'' کے حکیمانہ قول کے برعکس، لوگ اس خود ساختہ اصول پر عمل پیرا ہیں کہ ''انسان کھانے کے لیے ہی دُنیا میں آیا ہے''۔ بہت کم لوگ ایسے ملیں گے جو محتاط انداز میں اور صرف اتنا کھاتے ہیں کہ زندہ رہ سکیں۔

تندرستی ایک ایسی کیفیت ہے جس کو طبی اصطلاح میں صحت کہتے ہیں اور جس کی تعریف عالمی ادارہ صحت نے ان الفاظ میں کی ہے: صحت جسمانی، ذہنی اور سماجی حیثیت سے مکمل خوش حالی کا نام ہے نہ کہ محض بیماری اور کمزوری کے عدمِ وجود کا۔ تندرستی یا صحت کی یہ تعریف بہت جامع ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر کسی شخص کی کیفیت اس تعریف کے مطابق نہ ہو تو وہ صحت مند یا تندرست نہیں ہے۔

غذا ہمارے لیے ایندھن کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ جسم میں جل کر توانائی یا حرارے فراہم کرتی ہے۔ ہر فرد کی عمر، جسمانی ساخت اور کام کی نوعیت کے اعتبار سے صحت برقرار رکھنے کے لیے درکار حراروں کی مقدار مختلف ہوتی ہے۔ ایک سال سے کم عمر کے بچے کو روزانہ ۴۵ حرارے فی پونڈ جسمانی وزن کے حساب درکار ہوتے ہیں۔ تین سال کی عمر میں یہ ضرورت گھٹ کر ۴۰ حرارے فی پونڈ رہ جاتی ہے۔ چودہ سال کی عمر میں روزانہ اوسط ضرورت ۲۴ حرارے فی پونڈ، بالغ انسان کو ۱۶ حرارے فی پونڈ اور مستقل طور پر بستر پر دراز شخص کو ۱۱ حرارے فی پونڈ درکار ہوتے ہیں۔ جسمانی محنت و مشقت کا کام کرنے والے شخص کو ہر روز ۲۰ سے ۳۰ حرارے فی پونڈ درکار ہوتے ہیں۔

اگر کوئی شخص ایسی غذا لے رہا ہے جو درکار حراروں سے زائد فراہم کرنے کی اہلیت رکھتی ہو تو وہ زائد از ضرورت حرارے استعمال میں نہیں آتے بلکہ فربہی کا سبب بنتے ہیں۔ فربہ اشخاص کیوں کہ کم متحرک ہوتے ہیں لہٰذا انھیں درکار حراروں کی مقدار کم ہوتی جاتی ہے۔ لہٰذا انھیں چاہیے کہ درکار غذا سے کم کھایا کریں تاکہ انھیں غذا سے درکار حراروں سے کم مقدار میں حرارے فراہم ہوں اور اس کی کمی کو پورا کرنے کے لیے جسم کے اندر محفوظ زائد از ضرورت غذائیں تحلیل ہو کر درکار حراروں کی اس کمی کو پورا کریں۔ اس سے فربہی میں کمی ہو گی اور جسم صحت مند اور توانا و چاق و چوبند ہو جائے گا۔ اگر ایک شخص تندرست و چاق و چوبند ہے تو اسے اپنی صحت برقرار رکھنے کے لیے متوازن غذا بس اتنی ہی مقدار میں لینا چاہیے جسے معدہ اچھی طرح ہضم کر سکے اور جز و بدن بنا سکے۔ اگر جسم فربہ ہے تو ایسے شخص کو چاہیے کہ وہ تقلیل غذا کرے۔

ہفتہ میں کم از کم ایک بار تقلیل غذا کرنا کوئی نقصان دہ بات نہیں ہے بلکہ اطبا نے اس کی اتنی ہی اہمیت بتائی ہے جتنی کھانے کی بتائی ہے۔ قرآن کریم میں مخصوص شرائط کے ساتھ غذا سے اجتناب کے لیے ''صوم'' کی اصطلاح آتی ہے جس کے معنی ہیں ''رُک جانا''۔ ارکان اسلام میں تیسرا اہم اصول رکن روزہ ہے، جس کا سب سے بڑا مقصد تو رضائے الٰہی کا حصول ہے،

طبی اور جسمانی فائدہ اس کے علاوہ ہے۔ دن بھر کی بھوک پیاس کے بعد معدہ بالکل صاف ہو جاتا ہے اور افطار کے ذریعے مادی لذتوں سے لطف اندوز ہو کر کھوئی ہوئی طاقت دوبارہ حاصل ہو جاتی ہے، بشرطیکہ افطار اور رات کے کھانے میں لی جانے والی غذا مناسب، زود ہضم اور متوازن ہو۔

دُنیا میں کم کھانے یا فاقہ کرنے سے اتنے لوگ نہیں مرتے جتنے بسیار خوری کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اعداد و شمار سے ثابت ہو رہا ہے کہ بسیار خوری اور فربہی مہلک ہے۔ بچے بھی اگر فربہ ہیں تو کھیل کود میں حصّہ نہیں لے سکتے جس سے ان کی ذہنی صلاحیت اور کارکردگی ماند پڑ جاتی ہے۔ کھانے پینے میں عدم توازن اور اس کی وجہ سے پیدا ہونے والی فربہی کی ہلاکت خیزی کا علم سب کو ہے۔ علم دین اور علم بدن دونوں اس امر پر متفق ہیں کہ تقلیل غذا اور قناعت و سادگی ہی سلامتی کی ضمانت ہیں۔ روزہ ان کی تحصیل کا ایسا ذریعہ ہے جس کی اہمیت تمام آسمانی مذاہب میں ہمیشہ موجود رہی ہے اور جسے ہر دور میں طب نے بھی تسلیم کیا ہے۔

❖❖❖